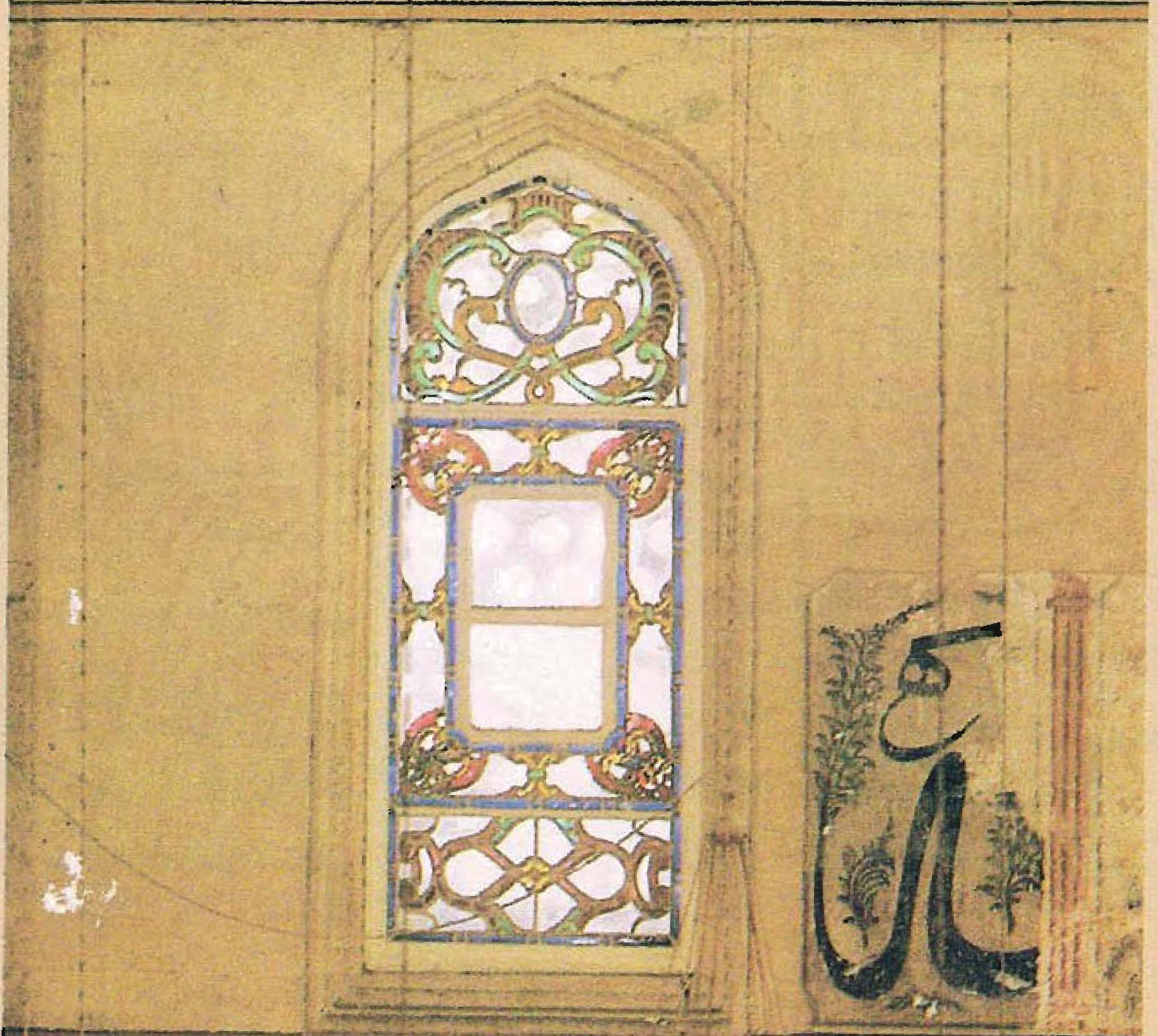
الرسالہ

Al-Risala

November 1999 • No. 276 • Rs. 9

منزل پر پہنچنے کی پہلی شرط یہ ہے کہ آپ نے
صحیح مقام سے اپنے سفر کا آغاز کیا ہو۔



عصری اسلوب میں اسلامی لٹریچر، مولانا وحید الدین خاں کے قلم سے

کتاب	قیمت
تذکیر القرآن (مکمل)	400.00
اسلام: ایک تعارف	80.00
اللہ اکبر	45.00
پیغمبر انقلاب	50.00
مذہب اور جدید چیلنج	55.00
عظمت قرآن	35.00
عظمت اسلام	50.00
عظمت صحابہ	7.00
دین کامل	60.00
الاسلام	45.00
ظہور اسلام	50.00
اسلامی زندگی	40.00
احیاء اسلام	35.00
راز حیات	65.00
صراط مستقیم	40.00
خاتون اسلام	60.00
سوشلزم اور اسلام	50.00
اسلام اور عصر حاضر	30.00
الربانیہ	40.00
کاروان ملت	45.00
حقیقت حج	30.00
اسلامی تعلیمات	35.00
اسلام دور جدید کا خالق	25.00
حدیث رسول	40.00
سفر نامہ (غیر ملکی اسفار)	85.00
راہ عمل	25.00
تعبیر کی غلطی	80.00
دین کی سیاسی تعبیر	20.00
عظمت مومن	7.00
اسلام ایک عظیم جدوجہد	5.00
تاریخ دعوت حق	5.00

کتاب	قیمت
مطالعہ سیرت (کتابچہ)	12.00
ڈائری (جلد اول)	80.00
کتاب زندگی	65.00
اقوال حکمت	25.00
تعمیر کی طرف	8.00
تبلیغی تحریک	20.00
تجدید دین	25.00
عقلیات اسلام	35.00
قرآن کا مطلوب انسان	8.00
دین کیا ہے؟	7.00
اسلام دین فطرت	7.00
تعمیر ملت	7.00
تاریخ کا سبق	7.00
فسادات کا مسئلہ	5.00
انسان اپنے آپ کو پہچان	5.00
تعارف اسلام	5.00
اسلام پندرہویں صدی میں	5.00
راہیں بند نہیں	12.00
ایمانی طاقت	7.00
اتحاد ملت	7.00
سبق آموز واقعات	7.00
زلزلہ قیامت	10.00
حقیقت کی تلاش	8.00
پیغمبر اسلام	5.00
آخری سفر	7.00
اسلامی دعوت	7.00
حل یہاں ہے	10.00
سچا راستہ	8.00
دینی تعلیم	7.00
امہات المومنین	20.00
تصویر ملت	85.00

کتاب	قیمت
دعوت اسلام	50.00
دعوت حق	40.00
نشری تقریریں	80.00
دین انسانیت	60.00
فکر اسلامی	50.00
شتم رسول کا مسئلہ	50.00
طلاق اسلام میں	5.00
مضامین اسلام	60.00
حیات طیبہ	7.00
باغ جنت	7.00
نار جہنم	7.00
خلیج ڈائری	10.00
رہنمائے حیات	7.00
تعدد ازواج	7.00
ہندستانی مسلمان	50.00
روشن مستقبل	7.00
صوم رمضان	7.00
اسلام کا تعارف	4.00
علما اور دور جدید	8.00
سفرنامہ اسپین و فلسطین	60.00
مارکسزم: تاریخ جس کو رد کر چکی ہے	12.00
سوشلزم ایک غیر اسلامی نظریہ	8.00
یکساں سول کوڈ	5.00
اسلام کیا ہے؟	8.00
میوات کا سفر	35.00
قیادت نامہ	35.00
مطالعہ سیرت	60.00
منزل کی طرف	4.00
اسباق تاریخ	85.00

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الرسالہ

Al-Risāla

اردو، اور انگریزی میں شائع ہونے والا
اسلامی مرکز کا ترجمان

زیر سرپرستی
مولانا وحید الدین خاں
صدر اسلامی مرکز

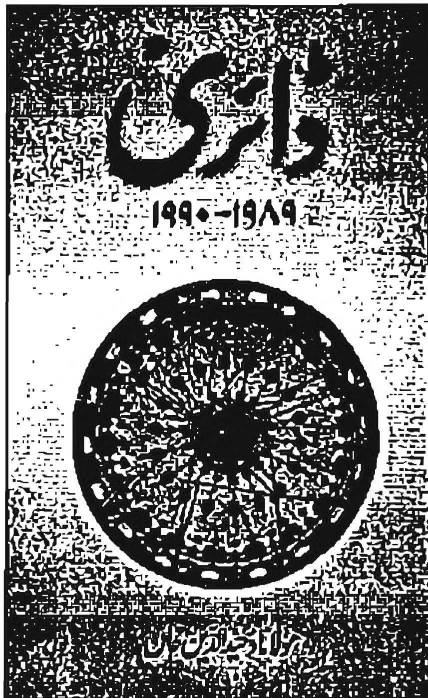
نومبر 1999 شمارہ 276

خصوصی شمارہ: ہند۔ پاک ڈائری

(دوسری قسط)

نئی کتابیں





Al-Risāla
1, Nizamuddin West Market,
New Delhi-110013
Tel. 4625454, 4611128
Fax 4697333, 4647980
skhan@vsnl.com
http://www.alrisala.org

SUBSCRIPTION RATES
Single copy Rs. 9
One year Rs. 100. Two years Rs. 195
Three years Rs. 290. Five years Rs. 480
Abroad: One year $ 10/£6 (Air mail)

DISTRIBUTED IN ENGLAND BY
IPCI: ISLAMIC VISION
481, Coventry Road, Birmingham B10 0JS
Tel. 0121-773 0137, Fax: 0121-766 8577
e-mail: info@ipci-iv.co.uk

DISTRIBUTED IN USA BY
AL-RISALA FORUM INTERNATIONAL
1439 Ocean Ave., 4C Brooklyn
New York NY 11230 Tel./Fax 718-2583435
e-mail: Kaleem@alrisala.org

Printed and published by Saniyasnain Khan on behalf of The Islamic Centre, New Delhi. Printed at Nice Printing Press, Delhi.

۱۹۴۷ کے بعد کے انڈیا میں مسلمانوں کے درمیان کم از کم دو شخصیتیں ایسی تھیں جو پورے معنوں میں قائدانہ اوصاف کی حامل تھیں۔ ایک مولانا سید حسین احمد مدنی، دوسرے مولانا ابوالکلام آزاد۔ مگر عجیب بات ہے کہ یہ دونوں ۱۹۴۷ سے پہلے کے ہندستان میں سراپا سرگرم بنے ہوئے تھے ۱۹۴۷ کے بعد کے ہندستان میں وہ تقریباً خاموش ہو کر رہ گئے۔ ان کے قائدانہ اوصاف کا کوئی فائدہ ۱۹۴۷ کے بعد کے ہندستان کو نہیں ملا۔

ان کے بعد اگرچہ بہت سے لوگ مسلم قیادت کے میدان میں سرگرمی دکھانے کے لئے اٹھے مگر وہ حقیقۃً اس عربی مثل کا مصداق تھے کہ: کبرنی موت الکبراء (بڑوں کی موت نے مجھ کو بڑا بنادیا)

آزادی کے بعد کے دور میں مسلمانوں کے درمیان بہت سی قیادتی تحریکیں اٹھیں مگر وہ سب کی سب بے نتیجہ اچھل کود کے ہم معنی بن گئیں۔ اس سلسلہ میں غالباً پہلی نمایاں تحریک وہ ہے جو اتر پردیش میں اٹھی۔ اس کا مقصد ریاست میں اردو کو ثانوی درجہ دلانا تھا۔ یہ ایک طوفان خیز تحریک تھی۔ کثیر تعداد میں مسلمانوں نے شہر شہر اور گاؤں گاؤں گھوم کر چودہ لاکھ دستخطوں کا ایک ڈھیر اکٹھا کیا۔ کاغذوں کا یہ ڈھیر ٹرکوں پر لاد کر دہلی لایا گیا تاکہ اس کو صدر جمہوریۂ ہند کی خدمت میں منظوری کے لئے پیش کیا جائے۔

یہ تحریک اپنے سارے جوش و خروش کے باوجود کتنی زیادہ بے حقیقت تھی اس کا اندازہ اس واقعہ سے بخوبی طور پر کیا جاسکتا ہے۔ پریزڈنٹ آف انڈیا کے سامنے اردو کی درخواست پیش کرنے کی یہ مہم جس کمیٹی کے تحت چلائی گئی اس کے صدر ڈاکٹر ذاکر حسین (وفات ۱۹۶۹) تھے۔ بعد کو یہی ڈاکٹر ذاکر حسین خود پریزڈنٹ آف انڈیا کی کرسی پر پہنچ گئے مگر وہ اردو کی اس درخواست کے بارے میں کچھ بھی نہ کرسکے۔ اس کا سبب یہ نہیں تھا کہ صدر ذاکر حسین اس کو کرسکتے تھے اور انھوں نے نہیں کیا، اس کا سبب یہ تھا کہ یہ کام حقیقی حالات کے اعتبار سے ہونے والا ہی نہ تھا اس

لئے وہ نہیں ہوا۔

۱۹۴۷ کے بعد بار بار مسلمانان ہند کے درمیان اس قسم کی جذباتی تحریکیں اٹھائی جاتی رہی ہیں جو یا تو بے نتیجہ رہیں یا ان کا معکوس نتیجہ بر آمد ہوا۔

مثلاً آل انڈیا مسلم مجلس مشاورت فرقہ وارانہ فسادات کو روکنے کے لئے اٹھی۔ مگر وہ ایک فی صد بھی فسادات کو روکنے میں کامیاب نہیں ہوئی۔ مسلم یونیورسٹی کو مسلم کردار دینے کے لئے طوفان خیز تحریک اٹھی مگر وہ ظاہری کامیابی کے باوجود مسلم یونیورسٹی کے معیار کو صرف پست کرنے کا ذریعہ بنی۔ ریزرویشن کی پر جوش تحریک نے مسلمانوں کو ریزرویشن تو نہیں دیا البتہ ان کے اندر سے اس جذبہ کو چھین لیا کہ وہ محنت کر کے آگے بڑھیں۔ شاہ بانو تحریک کی بظاہر شاندار کامیابی کا انجام صرف یہ ہوا کہ ہندو فرقہ پرست طاقتیں از سر نو زندہ ہو گئیں۔ بابری مسجد تحریک کا یہ برعکس انجام ہوا کہ ہندوؤں کا انتہا پسند طبقہ شدت سے بھڑک اٹھا یہاں تک کہ آپے سے باہر ہو کر اس نے بابری مسجد کو ڈھادیا۔

جو لوگ چیزوں کو ظاہری سطح (face value) پر لینے کے عادی ہیں وہ صرف اتنا ہی جانتے ہیں کہ کچھ غضبناک ہندوؤں نے بابری مسجد کو ڈھادیا مگر اصل حقیقت یہ ہے کہ بابری مسجد کو مسٹر ہندو نے نہیں ڈھایا بلکہ مسٹر ایگو نے ڈھایا۔ اور مسٹر ہندو کو مسٹر ایگو بنانے والے خود مسلمانوں کے نااہل قائدین تھے۔

جہاں تک میرا خیال ہے، ۱۹۴۷ کے بعد ہندستانی مسلمانوں کے درمیان کوئی ایسی قابل ذکر تحریک نہیں اٹھی جس کو مثبت معنوں میں تعمیری تحریک کہا جاسکے۔ اور موجودہ حالات میں غالباً ایسا ہونا ممکن بھی نہیں۔ اس کی بنیادی وجہ ہندستانی مسلمانوں کی غیر حقیقت پسندانہ سوچ ہے۔ وہ اپنے آپ کو غیر واقعی حد تک برتر اور اپنے ہم وطنوں کو غیر واقعی حد تک کمتر سمجھتے ہیں۔ جو لوگ اس طرح کی منفی نفسیات میں مبتلا ہوں ان کے درمیان صرف ردعمل کی تحریکیں ابھر سکتیں ہیں نہ کہ مثبت معنوں میں کوئی نتیجہ خیز تحریک۔

اس معاملہ کو سمجھنے کے لئے یہاں ایک نمائندہ مثال درج کی جاتی ہے۔ دہلی کے سہ روزہ دعوت میں مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کا ایک انٹرویو "افادۂ عام کی غرض سے" شائع کیا گیا ہے۔ اس انٹرویو کا ایک سوال اور جواب من وعن یہاں نقل کیا جاتا ہے۔

سوال: ملک میں روز بروز بڑھتی ہوئی ہندو فرقہ پرستی کے تناظر میں آپ کو یہاں انسانیت کا مستقبل کیسا نظر آتا ہے خصوصاً جب کہ آنجناب "پیام انسانیت" تحریک کے داعی وعلم بردار ہیں؟

جواب: درحقیقت انسانیت کا پیغام وقت کی اہم ترین ضرورت ہے۔ ملکی سطح پر جو زبردست سیاسی، تہذیبی اور اخلاقی خلا موجود ہے، اسے صرف مسلمان ہی پر کر سکتے ہیں۔ کیوں کہ وہ کتاب وسنت اور سیرت رسول ﷺ کے وارث ہیں۔ بلکہ میں تو پورے یقین واعتماد سے کہہ سکتا ہوں کہ اگر مسلمان نہ ہوتے تو یہ ملک عذاب الٰہی کا نشانہ بن جاتا اور اسے صفحۂ ہستی سے مٹا دیا گیا ہوتا۔ (سہ روزہ۔ دعوت دہلی، ۲۵ جنوری ۱۹۹۷)

جس ملک کے دو گروہوں میں سے ایک گروہ کی سوچ یہ ہو کہ دوسرا گروہ عذاب الٰہی کا مستحق ہو چکا ہے اور ملک میں صرف میری موجودگی اس کو اس بھیانک انجام سے بچائے ہوئے ہے۔ وہاں نفرت اور حقارت کا ماحول تو بن سکتا ہے مگر محبت اور احترام کا ماحول ایسے لوگوں کے درمیان کبھی نہیں بنے گا۔ اور جس ملک کے دو بڑے گروہوں کے درمیان اس قسم کا منفی ماحول ہو وہاں مثبت معنوں میں لوگوں کے درمیان معتدل انسانی تعلقات کا قیام ممکن ہی نہیں۔

20

آزادی (۱۹۴۷) کے بعد ہندستان میں جو پہلی پارلیمنٹ بنی اس کے ایک بنگالی ممبر پروفیسر ہیرن مکرجی تھے۔ پارلیمنٹ کے اجلاس میں شرکت کے بعد وہ دہلی سے کلکتہ کے لئے بذریعہ ٹرین روانہ ہوئے۔ وہ فرسٹ کلاس میں سفر کر رہے تھے۔ انھوں نے جب چلتی ہوئی ٹرین کے باہر نظر ڈالی تو سڑک کے دونوں طرف جھگی جھونپڑی کی قطاریں لگی ہوئی تھیں۔ گندگی اور

تاریکی کے غیر صحت مند ماحول میں عورت، مرد اور بچے اس طرح رینگ رہے تھے جیسے کہ وہ انسان نہ ہوں بلکہ جانور ہوں۔

پروفیسر ہیرن مکرجی اس منظر کو دیکھ کر بہت متاثر ہوئے۔ واپس پہنچ کر کلکتہ سے انھوں نے اس وقت کے وزیر اعظم پنڈت جواہر لال نہرو کو ایک خط روانہ کیا۔ اس خط میں انھوں نے لکھا کہ ٹرین کے فرسٹ کلاس میں بیٹھا ہوا جب میں جھگی جھونپڑی کی ان گندی بستیوں سے گذرا تو میں نے سوچا کہ اگر یہ لوگ مجھ سے پوچھیں کہ انڈیا کی آزادی سے ہم کو کیا ملا، تو میں ان کو کیا جواب دوں گا۔ پنڈت جواہر لال نہرو نے اسکے جواب میں پروفیسر ہیرن مکرجی کو جو خط روانہ کیا اس میں انھوں نے لکھا تھا کہ ...... تم اپنے حساس ہونے کی قیمت ادا کر رہے ہو:

You are paying the price of being sensitive.

یہ ایک علامتی واقعہ ہے جو بتاتا ہے کہ آزادی کے ابتدائی زمانہ ہی میں درد مند لوگوں نے ہمارے لیڈروں کے ضمیر کو کھٹکھٹایا۔ مگر وہ جاگنے کے بجائے خواب آور گولیاں کھا کر گہری نیند سو گئے۔ انھوں نے یاد دلانے والوں کو یہ کہہ کر چپ کرا دیا کہ یہ تمھاری حساسیت کا مسئلہ ہے نہ کہ کوئی حقیقی مسئلہ۔

ہمارے لیڈروں نے ایسا جواب کیوں دیا اس کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ ایک بار حکومت کا تجربہ کرنے کے بعد ان کی ساری دلچسپی اس سے ہو گئی کہ وہ اپنے اقتدار کو آخر وقت تک باقی رکھ سکیں۔ اب ان کی توجہات کا مرکز صرف یہ تھا کہ وہ کس طرح اگلے الکشن میں اپنے آپ کو شکست سے بچائیں اور الکشن جیت کر دوبارہ سیاسی اقتدار کی گدی پر بیٹھ جائیں۔ اس خود غرضانہ طرز فکر نے ہندستانی سیاست کو پہلے کرپٹ پالیٹکس بنایا، اور اس کے بعد اس کو وہ بدترین صورت دے دی جسے ممبئی کے مسٹر مدھو مہتا (وفات ۱۹۹۵) کریمنلائزیشن آف پالٹکس کہا کرتے تھے۔

شیخ سعدی شیرازی کا ایک شعر ہے کہ کسی چشمہ کا منبع ابتدا میں ایک تیلی سے بند کیا جاسکتا

ہے۔ مگر جب وہ بھر جائے تو اس کو ہاتھی کے ذریعہ بھی بند کرنا ممکن نہیں:

سرچشمہ شاید گرفتن بہ میل　　چو پر شد نشاید گذشتن بہ پیل

آزادی کے بعد ابتدائی دور میں اگر ہمارے لیڈر صرف اتنا کرتے کہ وہ جیت کے ساتھ ہار کو قبول کرنے کے لئے بھی تیار ہو جاتے تو ملک میں اتنا بگاڑ کبھی نہیں آسکتا تھا۔ ڈیماکریسی کی بنیاد الکشن پر ہے اور الکشن اگر صحیح طور پر کرائے جائیں تو کبھی ایک گروہ جیتے گا اور کبھی دوسرا گروہ۔ اس لئے ڈیماکریسی کا نظام درست طور پر صرف اس وقت چل سکتا ہے جب کہ پارٹیاں ہارنے کو بھی اسی طرح قبول کریں جس طرح وہ جیتنے کو قبول کرتی ہیں۔ اگر یہ مزاج نہ ہو تو برسر اقتدار پارٹی اپنے اقتدار کو مسلسل باقی رکھنے کے لئے ایسی بدعنوانیاں کرے گی جس کے نتیجہ میں پورا ملک تباہ ہو کر رہ جائے۔ بدقسمتی سے ہمارے ملک میں یہی کچھ پیش آیا ہے۔

21

۱۹۴۷ سے پہلے جو لوگ آل انڈیا کانگریس میں جڑے وہ طرح طرح کی سوچ کے لوگ تھے۔ ان کو جس چیز نے کانگریسی اتحاد میں اکھٹا کیا وہ صرف انگریز مخالف سیاست تھی۔ یہ لوگ پرو انڈیا جذبہ سے زیادہ اینٹی برٹش جذبہ کے تحت کانگریس کے پلیٹ فارم پر اکھٹا ہوئے تھے۔ آزادی کے بعد جب پنڈت جواہر لال نہرو کو ملک کا وزیر اعظم بنایا گیا تو کسی نے ان سے کہا کہ کانگریس میں تو طرح طرح کے لوگ اکھٹا ہیں۔ اس قسم کے مختلف لوگوں کو لے کر آپ کس طرح حکومت کا کاروبار چلائیں گے۔ پنڈت نہرو نے جواب دیا: ہر ایک کی ایک قیمت ہے، اور وہ قیمت میں اس کو ادا کر سکتا ہوں۔

پنڈت نہرو کا یہ فارمولا ایک مفاد پرست حکومت کو چلانے کے لئے کافی ہو سکتا تھا۔ مگر وہ ایک با اصول اور با کردار حکومت کو چلانے کے لئے قطعی طور پر ناکافی تھا۔ چنانچہ آزادی کے بعد ملک میں جو سیاسی ڈھانچہ بنا وہ یہ تھا کہ یہاں کوئی با اصول سیاسی نظام قائم نہ ہو سکا۔ اس کے برعکس جو کچھ پیش آیا وہ یہ تھا کہ ہر ایک اپنی "قیمت" وصول کرنے لگا۔ مزید یہ کہ اس کی یہ قیمت

بھی خود اس کے اپنے خود ساختہ اندازوں کی بنیاد پر تھی نہ کہ حقیقت واقعہ کی بنیاد پر۔

چنانچہ قیمت وصول کرنے کا یہ سلسلہ کہیں نہیں رکا۔ پہلے یہ قیمت ہزاروں میں وصول کی جاتی تھی۔ اس کے بعد لاکھوں میں قیمت لی جانے لگی۔ پھر کروڑوں میں اور مزید بڑھ کر اربوں کی مقدار میں لوگ اپنی قیمت وصول کرنے لگے۔ یہ معاملہ اتنا بڑھا کہ ہندستانی روپیہ کی شکل میں اپنی قیمت لینا لوگوں کو کم دکھائی دینے لگا۔ اب لوگ ڈالر اور پونڈ کی صورت میں اپنی قیمت وصول کرنے لگے۔ ملک کی دولت ہندستان سے نکل کر بیرونی ملکوں کے بینکوں میں جمع ہو گئی۔

یہاں تک کہ قیمت وصول کرنے کا یہ معاملہ ایک مستقل فن بن گیا۔ اب سیاسی اور حکومتی شخصیتوں نے یہ کیا کہ وہ ملکی اور سماجی ترقی کے نام پر بڑے بڑے منصوبے بنائے، صرف اس لئے کہ اس کے بہانے سے اپنے گھروں کو نوٹ سے بھرے ہوئے بوروں کا گودام بنا سکیں۔ ملک بدستور بے ترقی کی حالت میں رہا مگر ملکی ترقی کے نام پر حکومتی شخصیتوں اور بڑے بڑے افسروں کا یہ حال ہوا کہ ان کے گھروں میں دولت کے انبار لگ گئے۔ ملک کی سڑکیں بدستور ٹوٹی پھوٹی حالت میں پڑی رہیں مگر انھیں سڑکوں کے نام پر لوگوں کے شاندار ذاتی محل تعمیر ہو گئے۔

یہ معاملہ یہاں بھی نہیں رکا۔ حکومتی شخصیتوں نے دیکھا کہ ملکی ترقی کے نام پر وہ صرف ہندستانی روپیہ لوٹ سکتے ہیں۔ اب انھوں نے جنگ کا ہوا کھڑا کیا۔ سرحدی خطرات کو بڑھا چڑھا کر بیان کیا۔ صرف اس لئے تاکہ مغربی ملکوں کی اسلحہ فیکٹریوں سے نہایت مہنگی قیمت پر ہتھیاروں کی خریداری کا معاملہ کریں اور اس بہانے کروروں اور اربوں ڈالر باہر کی کمپنیوں سے بطور کمیشن وصول کر کے سوئزر لینڈ کے بنکوں میں خفیہ کھاتے کے طور پر جمع کر سکیں۔

پنڈت جواہر لال نہرو کا سوشلسٹ فارمولا ابتدائی طور پر ایک سادہ فارمولا دکھائی دیتا تھا۔ مگر اپنی انتہا کو پہنچ کر ان کا سوشلسٹ فارمولا ایک ایسا لوٹ فارمولا بن گیا جس کی کوئی مثال ہندستان کی ہزاروں سال کی تاریخ میں نہیں ملتی۔

آزادی کے بعد ہندستان میں لاقانونیت کی جو صورت پیش آئی وہ کوئی اتفاقی بات نہ

تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ اس کا بیج ۱۹۴۷ سے پہلے آزادی کی تحریک کے دوران ہی ڈال دیا گیا تھا۔ آزادی کے بعد جو لاقانونیت کا مزاج ملک میں پایا جاتا ہے وہ آزادی سے پہلے کے حالات ہی کا ایک براہ راست نتیجہ ہے۔

سبھاش چندر بوس نے کہا تھا کہ تم مجھ کو خون دو میں تم کو آزادی دوں گا۔ اس کے مقابلہ میں مہاتما گاندھی نے کہا کہ تم انگریزی قانون کو توڑو اور پھر تم کو آزادی مل جائے گی۔ شبھاس چندر بوس کے انقلاب میں اگر انسان قتل ہوتے تھے تو گاندھی کے انقلاب میں روایات قتل ہو گئیں۔ اور تاریخ بتاتی ہے کہ قتل انسان کے مقابلہ میں قتل روایات کا طریقہ زیادہ سخت ہے۔

مہاتما گاندھی کی پوری تحریک گویا پرامن قانون شکنی تھی۔۔۔۔ حکومت کو ماننے کے بجائے حکومت کو نہ ماننا، اسکولوں اور کالجوں سے لوگوں کو نکالنا، اس قسم کی بہت سی خلاف روایت چیزیں تھیں جن کو مہاتما گاندھی نے ملک میں رواج دیا۔ ان کی اس تدبیر کا ایک جزء وہ تھا جس کو سول نافرمانی (civil disobedience) کہا جاتا ہے۔

مہاتما گاندھی اور ان کے ساتھیوں کا خیال تھا کہ قانون شکنی کی اس تحریک کے ذریعہ وہ برٹش اقتدار کو غیر مستحکم کر رہے ہیں۔ ہمارا سماج صدیوں سے کچھ اخلاقی روایات پر قائم تھا۔ یدھشٹر کا قصہ ان اخلاقی روایات کی ایک علامتی مثال ہے۔ کہانی بتاتی ہے کہ یدھشٹر ایک سچے انسان تھے۔ اس بنا پر ان کا رتھ زمین کے اوپر اوپر چلتا تھا۔ مگر ایک جنگ کے موقع پر انھوں نے بظاہر ایک جھوٹ بات کہہ دی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کا رتھ زمین پر آگیا اس کے بعد پھر وہ کبھی زمین سے اوپر اٹھ کر نہیں چلا۔

قدیم ہندستانی سماج اس قسم کی بہت سی اخلاقی روایات کے اوپر قائم تھا۔ اس وقت کے سماج میں اس اخلاقی روایات کے ڈھانچہ کو توڑنا بہت زیادہ برا سمجھا جاتا تھا۔ ان روایات کا غلبہ ذہنوں پر اتنا زیادہ تھا کہ کوئی بھی شخص ان کو توڑنے کی ہمت نہیں کرتا تھا مہاتما گاندھی کی عوامی تحریک نے پہلی بار اس کا خاتمہ کیا۔

روایت شکنی اور قانون کی پامالی کے اس طریقہ کا نشانہ ۱۹۴۷ سے پہلے برٹش اقتدار تھا، ۱۹۴۷ کے بعد اس کا نشانہ خود ہندستانی سماج بن گیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہندستانی سماج ایک ایسا سماج بن گیا جس میں قانون اور اقدار کا احترام ختم ہو گیا تھا۔ جہاں لوگوں کے لئے قانون اور اخلاقی روایات کے خلاف عمل کرنا کوئی سنگین بات نہ تھی۔ آج ہندستانی سماج میں لوٹ اور انار کی کی جو کیفیت پائی جاتی ہے اس کا کم از کم ایک بڑا سبب یہی ہے۔

22

دنیا بھر میں مسلمانوں کی تعداد ایک بلین سے زیادہ ہو چکی ہے۔ اس تعداد کا تقریباً تہائی حصہ صرف برصغیر ہند میں آباد ہے۔ اسی طرح انڈیا میں ہندو ستر کرور سے زیادہ ہیں۔ کوئی ایک کمیونٹی اتنی بڑی تعداد میں کسی ایک ملک میں نہیں پائی جاتی۔ اس طرح ہندو اور مسلمان دونوں اس خطہ ارضی میں غیر معمولی امکانات کے حامل ہیں۔ مگر عجیب بات ہے کہ پچھلے سو سال کی ہنگامہ خیز سرگرمیوں کے باوجود دونوں میں سے کوئی بھی کمیونٹی کوئی قابل لحاظ کارنامہ انجام نہ دے سکیں۔

اس المیہ کا سبب کیا ہے۔ میرے نزدیک اس کا واحد سب سے بڑا سبب یہ ہے کہ اس پوری مدت میں کوئی دانش مند قیادت برصغیر ہند میں ابھر نہ سکی۔ اس مدت میں کچھ ایسے لیڈر ضرور دکھائی دیتے ہیں جن کو قوم کے حق میں مخلص کہا جا سکتا ہے۔ مگر دور اندیشی اور گہرے تدبر سے تقریباً ہر ایک خطرناک حد تک خالی تھا۔ اس لئے ان میں سے کوئی بھی پورے معنوں میں نتیجہ خیز تحریک وجود میں نہ لا سکا۔

قائد کی مثال باغبان جیسی ہے۔ باغ کے درخت آج لگائے جاتے ہیں مگر ان کا پھل بہت سال بعد مستقبل میں حاصل ہوتا ہے۔ اس لئے قائد کی صحیح پہچان یہ ہے کہ وہ ایسی تحریک اٹھا سکے جو مستقبل کے اعتبار سے نتیجہ خیز ثابت ہو۔ مگر بد قسمتی سے ایسا کوئی لیڈر نہ ہندوؤں میں پیدا ہوا اور نہ مسلمانوں میں۔

امریکہ کے ابتدائی لیڈروں نے امریکہ کو سائنسی تعلیم کے میدان میں ڈالا تھا۔ یہی کام بعد کو جاپان نے کیا۔

دوسری عالمی جنگ کے بعد ہندستان کے لیڈر اپنی سیاسی تحریک کو تیز کرنے کے لئے ہندستانی نوجوانوں کو اسکولوں اور کالجوں سے باہر لا رہے تھے، اسی زمانہ میں جاپانی لیڈر اپنے نوجوانوں کو اسکول اور کالج میں داخل کر کے انھیں بہترین تعلیم دلوا رہے تھے۔ یہ عمل لمبی مدت تک امریکہ اور جاپان میں جاری رہا۔ ان کی اگلی نسلوں کو اس نشانہ میں تبدیلی کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی۔ اس کے برعکس روس میں ۷۵ سال تک اسٹیٹ اکانمی کا غلغلہ رہا۔ اس کے بعد اس کو ترک کر کے لبرل اکانومی کے اصول پر قوم کو چلایا جانے لگا۔ یہی معاملہ چھوٹے پیمانے پر ہندستان میں پیش آیا۔

یہی وہ فرق ہے جس کی بنا پر ہم دیکھتے ہیں کہ امریکہ اور جاپان ایک ترقی یافتہ ملک ہیں اور روس اور ہندستان دونوں غیر ترقی یافتہ ملک۔ ترقی مسلسل طور پر جاری رہنے والا عمل ہے۔ اس لئے ترقی کے لئے وہی اسکیم کارآمد ہے جو قابل بقا (sustainable) ہو۔ جو اسکیم قابل بقا نہ ہو وہ ترقی کا ذریعہ بھی نہیں بن سکتی۔

اس معیار کی روشنی میں دیکھئے تو ہندوؤں اور مسلمانوں کے تمام بڑے بڑے لیڈر اس پر پورے اترتے ہوئے نظر نہیں آتے۔ مثال کے طور پر مہاتما گاندھی نے چرخا پر مبنی اکانمی کا نظریہ پیش کیا مگر وہ کچھ انفرادی لوگوں میں وقتی طور پر رہا اور اس کے بعد اس کا خاتمہ ہو گیا۔ اسی طرح پنڈت نہرو نے سرکاری اکانومی کو رائج کیا مگر چالیس سال بعد اس کو لپیٹ کر رکھ دینا پڑا۔

مولانا محمد علی جوہر نے خلافت تحریک کے نام پر تھوڑے دنوں کے لئے پورے برصغیر کو ہلا دیا مگر ۱۹۲۴ میں ان کی زندگی ہی میں اس طوفانی تحریک کا اس طرح خاتمہ ہو گیا جیسے کہ اس کا کوئی وجود ہی نہ تھا۔ اسی طرح مولانا ابوالاعلیٰ مودودی نے طاغوتی نظام کا نظریہ پیش کیا جس کا مطلب یہ تھا کہ مسلمان انسانی ساخت کے تمام نظاموں سے قطع تعلق کریں اور ان سے لڑ کر دنیا

بھر میں ان کا خاتمہ کر دیں۔ ورنہ اس دنیا میں ان کی زندگی ہی جائز زندگی نہ ہو گی۔ اس بے بنیاد نظریہ نے بھی ایک محدود عرصہ کے لئے وقتی جوش وخروش دکھایا اس کے بعد وہ کتابوں کے صفحات میں دفن ہو کر رہ گیا۔ اس کی وجہ بھی دوبارہ یہی تھی کہ اس عالم اسباب میں اس قسم کا انتہا پسندانہ تصور قابل بقا ہی نہ تھا۔

23

۱۹۳۸ میں عربی تعلیم کے لئے میں نے مدرسۃ الاصلاح (اعظم گڈھ) میں داخلہ لیا اس مدرسہ میں اس وقت ہندستان کی دو شخصیتوں کا زیادہ چرچا تھا۔ اردو میں مولانا ابوالکلام آزاد (وفات ۱۹۵۸) اور عربی میں مولانا حمید الدین فراہی (وفات ۱۹۳۰) اس زمانہ میں یہاں کے کتب خانہ (دارالمعلومات) میں مولانا آزاد کے الہلال کے پرچے مجلد صورت میں نہایت اہتمام کے ساتھ رکھے گئے تھے۔ عام کتابوں کی طرح یہ جلدیں اشو نہیں کی جاتی تھیں۔ ان کو صرف کتب خانہ میں ہی بیٹھ کر پڑھا جا سکتا تھا۔

الہلال کو پڑھ کر جو ذہن بنتا تھا وہ صرف استعمار سے نفرت کا ذہن تھا۔ اس کا ہر شمارہ گویا انگریزوں کے خلاف ایک بغاوت نمبر ہوتا تھا۔ اس کو پڑھ کر آدمی کے اندر صرف یہ ذہن پیدا ہوتا تھا کہ انگریز ایک قابل نفرت قوم ہے۔ ان کا مقصد حیات یہ ہے کہ اسلام اور مسلمانوں کو وہ نقصان پہنچائیں اور اگر ممکن ہو تو ان کو دنیا سے مٹا دیں۔

مولانا حمید الدین فراہی کوئی سیاسی آدمی نہ تھے۔ ان کا موضوع اصلاً تفسیر قرآن تھا۔ لیکن انگریزوں کے معاملے میں ان کے خیالات وہی تھے جو اس زمانے کے دوسرے علماء کے یہاں پائے جاتے تھے۔ اس زمانہ کے علماء عام طور پر انگریزوں سے سخت بیزار تھے۔ وہ انگریزوں کو اسلام کا دشمن نمبر ایک سمجھتے تھے۔ چنانچہ اس زمانہ کے علماء کے حالات میں عام طور پر یہ لکھا ہوا ملے گا کہ ''حضرت کو انگریزوں سے بہت نفرت تھی'' یہی حال خود مولانا حمید الدین فراہی کا بھی تھا۔ انھوں نے اپنی ساری زندگی قرآن کے مطالعہ میں گزاری۔ مگر قرآن سے انھیں آیتوں اور

سورتوں میں نظم کا مسئلہ تو ملا مگر انسان سے محبت کا مسئلہ انھیں شاید اس میں نہیں ملا۔

انگریز پروفیسر آرنلڈ (T.W. Arnold) کتاب دعوت اسلام (The Preaching of Islam) پہلی بار ۱۸۹۶ میں چھپی۔ اس وقت مولانا حمید الدین فراہی علی گڑھ میں تھے۔ خود کتاب کے انگریز مصنف بھی اس وقت استاذ کی حیثیت سے علی گڑھ میں موجود تھے۔ پروفیسر ارنلڈ (وفات ۱۹۳۱) نے ۵۰۰ صفحہ کی اس کتاب میں کامیابی کے ساتھ یہ دیکھایا ہے کہ اسلام تلوار کے ذریعہ نہیں پھیلا بلکہ دعوت و تبلیغ کے ذریعہ پھیلا۔

یہ کتاب لندن سے چھپ کر جب علیگڑھ آئی تو مولانا حمید الدین فراہی نے اس کو پسند نہیں کیا۔ ان کے نزدیک یہ کتاب انگریزوں کی سازش کا ایک حصہ تھی۔ انگریز اپنے استعماری مفاد کے تحت مسلمانوں سے جہاد کا جذبہ ختم کردینا چاہتے ہیں، اس لئے انھوں نے پروفیسر ارنلڈ سے اس قسم کی کتاب لکھوائی ہے۔ مولانا حمید الدین فراہی کا یہ احساس اتنا زیادہ بڑھا ہوا تھا کہ ایک انگریز ان کو اپنے عربی ترجمان کی حیثیت سے عرب لے جانا چاہتا تھا۔ انھوں نے اس کو دشمن اسلام کے ساتھ تعاون سمجھ کر اس سے انکار کردیا۔ بعد کو اپنے استاذ مولانا شبلی نعمانی (وفات ۱۹۱۴) کے کہنے پر بادل نخواستہ وہ مذکورہ انگریز کے ساتھ جانے پر راضی ہوئے۔

اس طرح مدرسہ میں مجھ کو جو ذہن ملا وہ نفرت انگریز (یا نفرت انسان) کا ذہن تھا۔ اسلام کا مطلوب ذہن محبت انسان کا ذہن ہے۔ مگر یہ ایک حقیقت ہے کہ پچھلے سو سال کے درمیان ہمارے رہنماؤں نے مسلمانوں کے اندر جو ذہن بنایا وہ براہ راست یا بالواسطہ طور پر نفرت انسان کا ذہن تھا۔ نہ کہ محبت انسان کا ذہن مجھے یاد ہے کہ اس وقت کے مشہور مسلم شاعر انور صابری ہمارے مدرسہ میں آئے انھوں نے وہاں اپنی کچھ نظمیں سنائیں ان کا ایک شعر بہت مقبول ہوا جواب تک مجھے یاد ہے:

تمنا ہے کہ دنیائے غلامی کو بدل ڈالوں شہنشاہوں کا سرپائے بغاوت سے کچل ڈالوں

مدرسۃ الاصلاح میں میرے استاذ مولانا امین احسن اصلاحی (وفات ۱۹۹۸) سیاسی اعتبار

سے کانگریسی تھے تاہم تقسیم (۱۹۴۷) کے بعد وہ پاکستان چلے گئے۔ وہاں وہ لاہور میں مقیم رہے اور وہیں ان کا انتقال ہوا۔ غالباً ۱۹۵۰ میں وہ کچھ دنوں کے لئے ہندوستان آئے تھے اور اپنے وطن بمہور (اعظم گڑھ) میں قیام کیا تھا۔ میں بھی چند دوسرے نوجوانوں کے ساتھ بمہور گیا۔ مولانا جب یہاں آئے تو ان کو حسب قاعدہ پولیس اسٹیشن جا کر اپنی آمد کا اندراج کرانا پڑا۔ اس قسم کی چیز ان کے مزاج کے خلاف تھی۔ چنانچہ ہم لوگوں سے گفتگو کے دوران انھوں نے کہا: پاکستان میں میں وزیر اعظم کو ڈانٹ سکتا ہوں، مگر انڈیا میں میں نمبر ۱۰ کا مجرم ہوں۔

استاذ کی زبان سے یہ جملہ سن کر اس وقت میرے اندر یہ تاثر پیدا ہوا کہ انڈیا بہت خراب ملک ہے اور پاکستان اس کے مقابلے میں بہت اچھا ملک ہے۔ اس کے ایک عرصہ بعد ۱۹۷۱ میں خود پاکستان گیا اور وہاں لاہور میں چند دن قیام کیا۔ اس سفر میں میرے ساتھ ٹھیک وہی واقعہ پاکستان میں پیش آیا جو مولانا امین احسن اصلاحی کے ساتھ انڈیا میں پیش آیا تھا۔ مجھ کو بھی وہاں پہنچ کر پہلے ہی دن پولیس اسٹیشن جانا پڑا اور وہاں اپنی آمد کی تفصیل پولیس کے رجسٹر میں درج کرانی پڑی۔

ان چند متفرق واقعات سے اندازہ ہوتا ہے کہ پچھلے سو سال کے اندر کس قسم کے خیالات چھائے رہے ہیں اور ہمارے اداروں اور ہماری شخصیتوں کے ذریعہ لوگوں کو کس قسم کا ذہن ملتا رہا ہے۔ مثلاً اس پورے دور میں ہم نے انگریز کے مسئلہ کو "غلامی" کا مسئلہ سمجھا حالانکہ زیادہ صحیح لفظوں میں وہ نو آبادیات (Colonialism) کا مسئلہ تھا۔ غلامی کا لفظ صرف نفرت اور حقارت پیدا کرتا ہے۔ وہ انگریزوں کا تعارف صرف ایک ظالم کے روپ میں کرتا ہے۔ اس کے برعکس نو آبادیات کا لفظ یہ بتاتا ہے کہ انگریزوں نے علم اور صنعت کے میدان میں ترقی کر کے ہمارے اوپر برتری حاصل کرلی۔ اسی برتری کے بنا پر وہ اس قابل ہوگئے کہ سات سمندر پار کر کے وہ ہمارے ملک میں آئیں اور یہاں حکومت کریں۔

اس طرح نو آبادیات کا لفظ نئی سوچ پیدا کرتا ہے۔ وہ ترغیب دیتا ہے کہ ہم بھی علم اور صنعت کے میدان میں ترقی کریں اور صحت مند مقابلہ کر کے ان سے آگے بڑھ جائیں۔ جب کہ

غلامی کے لفظ سے اس قسم کا کوئی مثبت ذہن نہیں بنتا۔

اسی طرح لوگوں کے اندر ایک عام کمزوری یہ ہے کہ وہ اپنے قریبی حالات کے زیر اثر رائے قائم کرتے ہیں اس بنا پر ان کی رائے اکثر غلط ہو جاتی ہے۔ ایک پاکستانی مسلمان کو انڈیا میں پولیس کے دفتر میں حاضری دینی پڑے تو انڈیا کے بارے میں اس کی رائے خراب ہو جاتی ہے۔ کیونکہ اس نے معاملہ کو صرف اپنے محدود تجربہ کے دائرے میں دیکھا۔ اگر وہ اس کے اس حقیقت کو سامنے رکھے کہ انڈیا کا ایک مسلمان جب پاکستان جاتا ہے تو وہاں بھی اس کو پولیس اسٹیشن میں اسی طرح حاضری دینی پڑتی ہے۔ اگر وہ دونوں قسم کے واقعات کو ملا کر سوچے تو اس کی رائے میں توازن پیدا ہو جائے گا۔

اس سے بھی زیادہ اہم بات یہ ہے کہ یہ سوچا جائے کہ یورپ میں لوگ ایک ملک سے دوسرے ملک میں ویزا کے بغیر آسانی کے ساتھ آتے جاتے رہتے ہیں۔ پھر انڈیا میں اس کے خلاف صورت حال کیوں۔ اس پر غور کرنے کے بعد معلوم ہوگا کہ اس کا سبب ہمارے لیڈروں کی غلط سیاست ہے۔ یورپ میں ایک ملک اور دوسرے ملک کے درمیان نفرت کی سیاست نہیں چلائی گئی۔ اس لئے وہاں مختلف ملکوں کے درمیان معتدل حالات موجود ہیں۔ انڈیا اور پاکستان میں اس کے برعکس نفرت اور کشاکش کی سیاست چلائی گئی۔ دراصل یہی منفی سیاست ہے جس کا انجام آج برصغیر ہند کے لوگ بھگت رہے ہیں۔

24

۱۹۶۶ میں لکھنؤ مسلم سیاست کا مرکز بنا ہوا تھا۔ مولانا ابوالحسن علی ندوی، مولانا محمد منظور نعمانی، ڈاکٹر عبدالجلیل فریدی وغیرہ، نہایت جوش و خروش کے ساتھ ڈاکٹر رام منوہر لوہیا کی "نان کانگریس ازم" کی مہم میں شریک تھے۔ اس زمانے میں ایسی تقریریں کی جا رہی تھیں جیسے کہ کانگریس کو ہرانا مسلمانوں کا مستقبل بنانے کے ہم معنی ہے۔

میں اس سیاست کو سراسر ایک بے فائدہ سیاست سمجھتا تھا۔ میں نے اس تحریک کے

اکثر رہنماؤں سے تبادلۂ خیال کرنے کی کوشش کی۔ مگر اس وقت وہ اتنے جوش میں تھے کہ کوئی بھی شخص کچھ سننے کے لئے تیار نہ ہوا۔ آخر کار میں ۱۶؍اپریل ۱۹۶۷ کو ڈاکٹر عبدالجلیل فریدی سے ملا۔ یہ گفتگو لکھنؤ میں (فریدی بلڈنگ، حضرت گنج) میں ہوئی۔ پون گھنٹہ تک گفتگو جاری رہی۔ میں نے ان کے تمام دلائل کو رد کرتے ہوئے انھیں بتایا کہ کسی پولیٹکل پارٹی کو ہرانا مسلمانوں کے لئے کسی مثبت نتیجہ کو پیدا کرنے والا نہیں بن سکتا۔ جب ڈاکٹر فریدی کے پاس میری دلیلوں کا کوئی جواب نہ رہا تو آخر میں انھوں نے کہا: اسٹیٹس کو میں چینج تو ہوگا (یعنی موجودہ سیاسی صورتحال میں تبدیلی تو ہوگی) اس کے بعد گفتگو ختم ہوگئی۔

ڈاکٹر عبدالجلیل فریدی (وفات ۱۹۷۴) کا یہ جواب علامتی طور پر موجودہ زمانہ کی پوری مسلم قیادت پر صادق آتا ہے۔ اس زمانہ میں تقریباً ہر مسلم قائد (نہ صرف ہندستان میں بلکہ ساری دنیا میں) بس پولیٹکل اسٹیٹس کو میں چینج لانے کی سیاست چلاتا رہا، صرف اس فرق کے ساتھ کہ کسی نے شعوری طور پر ایسا کیا اور کسی نے غیر شعوری طور پر۔

موجودہ زمانے کے مسلم رہنماؤں کی ہنگامہ خیز کوششیں کوئی مثبت نتیجہ پیدا کئے بغیر ختم ہوگئیں۔ اس کی واحد مشترک وجہ یہ تھی کہ انھوں نے سیاسی اسٹیٹس کو میں چینج کو کام سمجھ لیا۔ وہ بار بار اس اسٹیٹس کو میں تبدیلی لانے کے لئے دھواں دار تحریکیں چلاتے رہے، صرف اس لئے کہ جو کچھ پہلے حاصل تھا وہ بھی ان سے چھن جائے۔

اصل یہ ہے کہ اسٹیٹس کو میں چینج لانے کے لئے تحریک چلانا کوئی تحریک ہی نہیں۔ کرنے کا اصل کام یہ ہے کہ جو اسٹیٹس کو بن گیا ہے اس کو وقتی طور پر تسلیم کرتے ہوئے حاصل شدہ مواقع کار کو مثبت تعمیر کے لئے استعمال کیا جائے جو سیاسی اسٹیٹس کو آپ کو یہ موقع دیتا ہے کہ آپ اس کے خلاف تحریک چلائیں وہ مزید اضافہ کے ساتھ آپ کو یہ موقع دے گا اس کو چھیڑے بغیر غیر نزاعی دائرے میں خاموش تعمیر کی کامیاب جدوجہد کریں۔

اسٹیٹس کو میں چینج ایک سلبی عمل ہے اور اسٹیٹس کو سے ٹکرائے بغیر غیر سیاسی میدان

میں کوشش کرنا ایک ایجابی عمل۔

اس دنیا میں ہمیشہ ایسا ہوتا ہے کہ مختلف اسباب سے ایک فریق اور دوسرے فریق کے درمیان ایک اسٹیٹس کو قائم ہو جاتا ہے۔ اگر کام کا آغاز اس اسٹیٹس کو کے بدلنے سے کیا جائے تو پہلے ہی مرحلے میں فریق ثانی سے ٹکراو پیش آجائے گا۔ مزید یہ سراسر غیر یقینی ہوتا ہے کہ اگر اسٹیٹس کو بدل بھی جائے تو اس کے بعد جو صورت حال پیدا ہو گی وہ کس کے حق میں ہو گی۔ مثال کے طور مصر کے اسلام پسندوں نے شاہ فاروق کے زمانے میں پولیٹکل اسٹیٹس کو کے بدلنے کی کوشش کی مگر جب وہ بدلا تو وہ اسلام پسندوں کے بجائے فوجی افسروں کے حق میں چلا گیا۔ پاکستان کے اسلام پسندوں نے صدر ایوب خاں کے زمانہ میں پولیٹکل اسٹیٹس کو میں تبدیلی کی کوشش کی ۔ مگر جب وہ بدلا تو وہ اسلام پسندوں کے بجائے سیکولر لیڈروں کے حق میں چلا گیا۔ اسی طرح ہندوستان میں انگریزوں کے زمانے میں جو پولیٹکل اسٹیٹس کو تھا اس کو نیشنلسٹ مسلمانوں نے بدلنے کی کوشش کی مگر جب وہ بدلا تو نیشنلسٹ مسلمانوں کے بجائے دوسری پارٹیوں کے حق میں چلا گیا۔ وغیرہ۔ اس لئے صحیح اور مفید طریقہ کار یہ ہے کہ اسٹیٹس کو کو عملاً قبول کرتے ہوئے بقیہ دائروں میں اپنے تعمیر واستحکام کی جدوجہد جاری کی جائے۔ بالفاظ دیگر مسائل کو نظر انداز کرتے ہوئے مواقع کو استعمال کیا جائے۔ یہی طریقہ درست ہے اور یہی طریقہ نتیجہ خیز بھی۔

25

بی بی سی لندن سے ۳۱ر مئی ۱۹۹۸ کو ایک ادبی پروگرام نشر ہوا۔ یہ سعادت حسن منٹو کے بارے میں تھا۔ وہ اردو کے مشہور افسانہ نگار تھے۔ ان کی پیدائش انڈیا میں ہوئی۔ تقسیم (۱۹۴۷) کے وقت وہ بمبئی میں تھے۔ اس کے بعد وہ پاکستان چلے گئے ۔ ۱۹۵۵ میں لاہور میں ان کا انتقال ہو گیا۔ انھوں نے کیوں ایسا کیا کہ وہ انڈیا کو چھوڑ کر پاکستان چلے گئے۔ نشریہ میں بتایا گیا تھا کہ اس سوال کا جواب خود سعادت حسن منٹو نے عصمت چغتائی کو ان الفاظ میں دیا تھا: پاکستان میں مسلمانوں کا مستقبل روشن ہے وہاں ہر طرف ہم ہی ہم ہوں گے۔ خوب ترقی کریں گے۔

یہی ذہن تمام ان لوگوں کا تھا جو پاکستان کے حامی تھے۔ مگر واقعات بتاتے ہیں کہ پچاس سال گذرنے کے بعد بھی پاکستان کا مسلمان مطلوب ترقی حاصل نہ کرسکا۔ حتی کہ خود پاکستان کے لوگ اپنے ملک کے حالات سے اتنا زیادہ غیر مطمئن ہوئے کہ تعلیم یافتہ پاکستانیوں کی بہت بڑی تعداد باہر کے ملکوں میں چلی گئی۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ نظریہ بذات خود غلط تھا کہ جس ملک میں صرف ایک قوم کے لوگ بستے ہوں وہاں خوب ترقی ہوگی۔ بلکہ اصل معاملہ اس کے بالکل برعکس ہے۔ ترقی کے لئے فطرت کا ایک اٹل قانون ہے اور جب بھی کوئی قوم ترقی کرتی ہے تو وہ اسی قانون کے مطابق کرتی ہے۔ کوئی خود ساختہ نظریہ کبھی کسی قوم کو ترقی کی طرف نہیں لے جاتا۔

فطرت کے قانون کے مطابق، ترقی کا تعلق چیلنج اور مسابقت پر ہے نہ کہ یکسانیت پر۔ کوئی قوم اس وقت ترقی کرتی ہے جب کہ وہ مسابقت کے ماحول میں ہو، جب کے اسے دوسروں کی طرف سے چیلنج پیش آرہا ہو۔ جہاں چیلنج نہ ہو وہاں یقینی طور پر ترقی بھی نہ ہوگی۔ مسلمانوں کی ترقی کا راز یہ تھا کہ وہ غیر منقسم ہندستان میں ہندوؤں کے درمیان مثبت ذہن کے ساتھ رہتے۔ اس طرح دونوں کے درمیان صحت مند مقابلہ (Healthy competition) جاری ہوتا۔ یہ مقابلہ دونوں کے لئے ترقی کا ضامن بن جاتا۔

جب بھی مختلف گروہ ملکر ساتھ رہیں تو ان کے درمیان مختلف قسم کے ناخوشگوار واقعات پیش آتے ہیں جو ایک دوسرے کے لئے شکایت کا باعث بنتے ہیں۔ ۱۹۴۷ سے پہلے ایسا ہی معاملہ غیر منقسم ہندستان میں پیش آیا۔ یہاں ہندو اور مسلم دونوں طرف کے قائدین صحیح رہنمائی دینے میں ناکام رہے۔ ہندی اخبارات مسلمانوں کی باتوں کو زیادتی کا روپ دے کر پیش کرتے رہے۔ دوسری طرف اردو اخبارات مزید اضافہ کے ساتھ ہندوؤں کے واقعات کو تعصب اور ظلم کی شکل میں چھاپتے رہے۔ حالانکہ دونوں طرف کے لکھنے اور بولنے والوں کو یہ کرنا چاہیئے تھا کہ وہ اپنی اپنی قوم کو بتائیں کہ اس طرح کی ناخوشگوار باتیں ہر سماج میں پیش آتی ہیں۔ حتی کہ

ایسے ماحول میں بھی جہاں تمام لوگ ایک ہی مذہب اور ایک ہی کلچر کے ماننے والے ہوں۔ ان کو چاہیئے تھا کہ وہ لوگوں کے اندر یہ ذہن بنائیں کہ وہ اس طرح کے واقعات کو چیلنج کے روپ میں لیں نہ کہ زیادتی کے روپ میں۔

اگر بروقت لوگوں کو یہ رہنمائی دی جاتی تو وہ جانتے کہ غیر منقسم انڈیا ترقیاتی امکان کے اعتبار سے موزوں ترین ملک ہے۔ یہاں وہ حالات پوری طرح موجود ہیں کہ آزاد ماحول میں دونوں فرقوں کے درمیان صحت مند مقابلہ جاری ہو۔ اور پھر فطرت کے قانون کے مطابق، دونوں تیزی کے ساتھ ترقی کا سفر طے کریں۔ مگر بروقت صحیح رہنمائی نہ ملنے کی وجہ سے دونوں میں سے کوئی بھی حقیقی ترقی حاصل نہ کر سکا۔

26

میرا احساس یہ ہے کہ ۱۹۴۷ سے پہلے ملک میں جو ہندو رہنما یا مسلم رہنما ابھرے۔ ان میں سے کوئی بھی حقیقی معنوں میں کسی کریڈٹ کا مستحق نہیں۔ دونوں نے یکساں طور پر حریفانہ قسم کی تحریکیں چلائیں ایک طرف ظفر علی خاں نے کہا:

دنیا میں بلائیں دو ہی ہیں — اک ساور کر اک گاندھی ہے

اک کفر کا چلتا جھکڑ ہے — اک ظلم کی چلتی آندھی ہے

دوسری طرف گرو گولوالکر نے یہ نظریہ پیش کیا کہ بھارت میں صرف ہندو ہی سچے نیشلسٹ ہیں۔ کیوں کہ یہ صرف ہندو ہیں جو انڈیا کو ہولی لینڈ کے طور پر دیکھتے ہیں۔ اس سرزمین کا ہر ذرہ ان کے لئے مقدس ہے۔ مسلمان چونکہ نیشنلٹی کے ٹسٹ پر پورے نہیں اترتے اس لئے وہ نیشنلسٹ نہیں ہیں (بنچ آف تھاٹ از گرو گولوالکر)

عجیب بات ہے کہ مسلمانوں کے محبوب شاعر اقبال نے بھی یہی بات ان لفظوں میں کہی تھی:

خاک وطن کا مجھ کو ہر ذرہ دیوتا ہے

مگر اسی کے ساتھ اقبال نے اس کے برعکس بات بھی ان لفظوں میں کہی:

ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے　　　جو پیرہن اس کا ہے وہ مذہب کا کفن ہے

تاہم ان معاملے میں مسلمانوں کا جو ذہن بنا وہ خواہ کسی اور کے موافق ہو یا نہ ہو، تاہم وہ اینٹی گرد گولوالکر ضرور تھا۔

یہ مزاج اتنا بڑھا کہ دونوں کی صحافت میں صرف الفاظ کا فرق رہ گیا۔ مثال کے طور پر ریڈینس ایک مسلم ہفتہ وار ہے اور آرگنائزر ایک ہندو ہفتہ وار۔ مگر باعتبار حقیقت دونوں میں اتنی ہی یکسانیت ہے کہ یہ کہنا شاید غلط نہ ہوگا کہ آرگنائزر ہندوؤں کا ریڈینس ہے اور ریڈینس مسلمانوں کا آرگنائزر۔

برصغیر ہند میں مسلم پریس کی پہچان یہ بن گئی کہ وہ اینٹی ہندو لہجہ میں بولتا ہو اور ہندو پریس کی پہچان یہ بن گئی کہ وہ اینٹی مسلم لہجہ میں بولتا ہو۔ پروانسانیت لہجہ نہ ہندو پریس کا رہا اور نہ مسلم پریس کا۔ اس معاملہ میں بعض استثناء ہو سکتے ہیں مگر برصغیر ہند کی پریس کا عمومی انداز یہی ہے۔

27

مہاتما گاندھی ہندوستان کی سیاسی آزادی کو ملک کے تمام مسائل کا حل سمجھتے تھے۔ وہ کہا کرتے تھے کہ میرا مشن صرف انگریزوں کو ملک سے نکالنا نہیں ہے بلکہ میرا مشن ہر آنکھ کے آنسو پوچھنا ہے:

My mission is to wipe away tears from all faces.

مگر آزادی کے پچاس سال بعد بھی ملک کی یہ حالت ہے کہ رونے والی آنکھوں کی تعداد پہلے سے بھی زیادہ ہو چکی ہے۔ آج ہمارا ملک اس سے بھی زیادہ مسائل سے دوچار ہے جس سے وہ ۱۹۴۷ سے پہلے دوچار تھا۔

اس کا سبب کیا ہے۔ گہرائی کے ساتھ دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ مہاتما گاندھی اور ان کے

ساتھیوں کا یہ اندازہ درست نہ تھا۔ انگریز کے سیاسی غلبہ کا خاتمہ ملک میں ترقی اور خوشحالی کے نئے دور کا آغاز ہے۔ اس معاملہ میں ہمارے لیڈر معصومانہ حد تک ایک غلط اندازہ کا شکار ہوئے۔

وقت کے بہت سے دوسرے سیاسی رہنماؤں کی طرح، مہاتما گاندھی نے یہ سمجھ لیا کہ ملک میں انگریزوں کا راج تمام خرابیوں کا منبع (Source of all evils) ہے۔ جب بدیشی راج ختم ہو گا اور دیشی راج ملک میں آئے گا تو اس کے بعد اپنے آپ سارے معاملات درست ہو جائیں گے۔ مگر یہ انسانی نفسیات اور تاریخی عوامل سے معصومانہ حد تک بے خبری کا نتیجہ تھا۔ کیونکہ سماجی حالات خود سماج کی اصلاح سے درست ہوتے ہیں نہ کہ حکومتی افراد کی تبدیلی سے۔ یہی وجہ ہے کہ مہاتما گاندھی اور ان کے ساتھیوں کا لایا ہوا سوراج محض ایک قسم کا (coupe) بن گیا۔ نہ کہ وہ چیز جس کو انقلاب (revolution) کہا جاتا ہے۔ کو میں صرف حکمراں افراد بدلتے ہیں، جب کہ انقلاب میں پورے سماجی حالات میں ایک نیا دور آجاتا ہے (اس معاملہ کی تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو، انگریزی اخبار پانیر ۲۶ر جنوری ۱۹۹۷)

۲۰ر جنوری ۱۹۹۷ کی مذکورہ میٹنگ میں میری بات سن کر ایک تعلیم یافتہ ہندو نے کہا کہ آپ مہاتما گاندھی پر تنقید کر رہے ہیں۔ میں نے جواب دیا کہ یہ مسئلہ کسی شخصیت کا نہیں ہے بلکہ ملک کا ہے:

I love Gandhi, but I love India more than Gandhi.

میں نے کہا کہ یہ تنقید نہیں ہے بلکہ وہ از سر نو جائزہ (re-assessment) ہے اس قسم کا جائزہ اس لئے ضروری ہے کہ ہم بار بار اسی سابقہ غلطی کو دوہرا رہے ہیں۔ مثال کے طور پر ۱۹۷۷ میں جئے پرکاش نرائن نے پورن سوراج (Total revolution) کا آندولن چلایا اس کا فلسفہ بھی عین وہی تھا۔ ہمارے پچھلے لیڈروں نے برٹش راج کو تمام خرابیوں کا سر چشمہ سمجھا تھا۔ اسی نظریہ کے تحت جئے پرکاش نرائن نے کانگریس راج کو ملک کی تمام خرابیوں کا سر چشمہ سمجھ لیا اور اس کے خلاف دھواں دھار تحریک شروع کر دی۔

کانگریس راج ختم کرنے کی حد تک یہ تحریک صد فی صد کامیاب رہی۔ مگر مطلوب ریولیوشن لانے میں وہ صد فی صد ناکام رہی۔ ٹوٹل ریولیوشن تو درکنار جزئی ریولیوشن بھی اس کے ذریعہ سے نہ آسکا۔ اس لئے انتہائی ضروری ہے کہ ماضی کی سیاسی تاریخ کا بے لاگ جائزہ لیا جائے تاکہ ہم ایک ہی غلطی کو بار بار دھرانے سے بچ جائیں۔

حقیقت یہ ہے کہ انقلاب کا راز غیر سیاسی اداروں کی تبدیلی میں ہے نہ کہ کسی سیاسی گدی کے گدی نشین کو بدلنے میں۔

28

زیکو سلوا کیا (Czechoslovakia) پر جرمن ڈکٹیٹر ہٹلر کے قبضہ کے بعد وہاں کے بہت سے یہودی بھاگ کر دوسرے ملکوں میں چلے گئے۔ ان میں ایک یہودی جوڑا ڈاکٹر نیڈل اور مسز نیڈل ہندوستان آئے۔ یہ لوگ ایک دستکاری کے ماہر تھے جو اس وقت کے زیکو سلوا کیا میں پائی جاتی تھی، وہ مخصوص ٹکنیک سے شیشہ کو پگھلا کر اس سے آرائشی چیزیں بناتے تھے۔ یہ ۱۹۳۸ کا زمانہ تھا جب کہ ہندوستان کی کئی ریاستوں میں کانگریس کی حکومت پہلی بار قائم ہوئی تھی۔ یوپی گورنمنٹ کے تکنیکل ایجوکیشن کے ڈپارٹمنٹ نے اس یہودی جوڑے کو بنارس ہندو یونیورسٹی میں ٹھہرایا۔ اور یہ انتظام کیا کہ وہ اپنا یہ فن ہندوستانیوں کو سکھائیں۔

یوپی کی کانگریس حکومت کے تعاون سے جن لوگوں نے اس صنعت کو سیکھا ان میں میرے بڑے بھائی عبدالعزیز خاں (وفات ۱۹۸۸) بھی تھے۔ اس فن کو سیکھنے کے بعد انھوں نے ۱۹۴۴ میں اعظم گڈھ میں لائٹ اینڈ کمپنی کے نام سے ایک کارخانہ کھولا جو بعد کو لائٹ اینڈ کمپنی لمٹیڈ بن گیا۔

میرے بھائی ڈاکٹر نیڈل کے بہت سے قصے سناتے تھے۔ انھوں نے بتایا کہ ڈاکٹر نیڈل ڈسپلن کا بہت زیادہ پابند تھا۔ ایک منٹ ادھر ادھر ہونا اس کو گوارہ نہ تھا۔ ایک بار اس نے زیر تربیت نوجوانوں کو گورنمنٹ کی کوئی ہدایت بتائی ایک مرحلہ میں اس کو محسوس ہوا کہ لوگ سختی

سے اس ہدایت کی پابندی نہیں کر رہے ہیں۔ اس نے تقریباً چیخ کر کہا کہ یہ ایک سرکاری حکم ہے۔

It is a government rule.

میرے بھائی جو سامان تیار کرتے تھے وہ زیادہ تر باہر کے علاقوں میں بھیجا جاتا تھا۔ مثلاً ساؤتھ انڈیا، سری لنکا وغیرہ۔ یہ پورا کام ڈاکخانہ کے ذریعہ ہوتا تھا۔ اس زمانہ میں ڈاکخانہ نہایت صحت کے ساتھ کام کرتا تھا۔ ایک بار ایک پوسٹ مین نے ہماری کوئی ڈاک گڑبڑ کردی۔ بھائی صاحب نے اس کی شکایت لکھ کر ڈاکخانہ بھیج دی۔ اس کے بعد ڈاکخانہ کا پورا محکمہ، حتی کہ پوسٹ آفس سپرنٹنڈنٹ اس طرح سرگرم ہوگئے جیسے کہ کوئی ہنگامی صورت حال پیدا ہوگئی ہو۔ یہ معاملہ صرف اس وقت ختم ہوا جب کہ پوسٹ مین نے آکر میرے بھائی سے معافی مانگی اور انھوں نے اس کو تحریری معافی نامہ دے دیا۔

یہ ۱۹۴۷ سے پہلے کا وہ ہندستان تھا جس کو بہت سے دوسرے دیکھنے والوں کے ساتھ میں نے بھی دیکھا اور جانا۔ آج یہ ہندستان کہیں موجود نہیں۔ آج یہ حالت ہے کہ سرکاری ہدایات آتی ہیں اور دفتروں میں فائل کرکے رکھ دی جاتی ہیں۔ نہ کوئی ان کو سنجیدگی کے ساتھ پڑھتا اور نہ وہ ان پر عمل کرتا۔

۱۹۴۷ کے بعد جب ہمارے سماج میں بگاڑ آیا اور ہر شعبہ میں گراوٹ کے آثار ظاہر ہوئے تو ہمارے نئے حکمرانوں نے اس کا حل یہ نکالا کہ وہ ہر مسئلہ پر ایک قانون بنائیں۔ انگریزوں نے اپنے دو سو سالہ حکومت کے دوران صرف پانچ سو قانون بنائے تھے۔ مگر آزادی کے بعد ہماری حکومت نے پچاس سال کے اندر پانچ ہزار سے زیادہ قوانین بناڈالے۔ ان کے علاوہ قاعدوں اور ضابطوں کی صورت میں روزانہ جو احکام جاری ہوتے رہتے ہیں ان کی تعداد لاکھوں تک پہنچتی ہے۔ مگر آج یہ حالت ہے کہ سرکاری دفتروں میں کوئی شخص قانون اور ضابطہ کے حوالہ سے اپنا کوئی حق نہیں پاسکتا۔ اب سرکاری دفتروں سے لے کر عدالتوں تک ہر جگہ رشوت اتنا زیادہ عام ہوچکی ہے کہ مزید پیسہ خرچ کئے بغیر کسی کا کوئی کام ہونا ممکن ہی نہیں۔

قانون کی کثرت نے موجودہ ہندستان کو قانون کا جنگل بنادیا ہے قوانین کی یہ کثرت ترقی کی راہ میں روکاوٹ ہے نہ کہ معاون، نئی دہلی کے ایک سینئر وزیر نے جون ۱۹۹۸ میں اپنی ایک گفتگو کے دوران کہا کہ میں حکومت میں بڑے بڑے ارادے لے کر آیا تھا مگر یہاں حالت یہ ہے کہ میرا بیشتر وقت قانون اور ضابطہ کی خانہ پوری میں الجھا رہتا ہے۔ دفتر میں ہر روز میرا تقریباً دس گھنٹہ کاغذوں کے انبار پر دستخط کرنے میں گذر جاتا ہے۔

۱۹۴۷ سے پہلے انگریزی حکومت کے زمانہ میں موجودہ قسم کے کرپشن کا کوئی تصور ہی نہ تھا جو آج ہر جگہ پایا جارہا ہے۔ میں نے ایک میٹنگ میں کہا کہ اس صورت حال کی ذمہ داری سب سے زیادہ ہمارے ان لیڈروں پر ہے جو تحریک آزادی کے ہیرو سمجھے جاتے ہیں۔ سوال یہ ہے ان ہیروؤں نے اس حقیقت کو کیوں نہیں جانا کہ ملک کو انگریزوں سے آزاد کر کے وہ اس کو جس سماج کے حوالہ کر رہے ہیں وہ ایک دولت پرست سماج ہے۔ انگریزی دور میں محکوم ہونے کی بنا پر اس کی دولت پرستی چھپی ہوئی ہے۔ جیسے اس کو حاکمانہ حیثیت حاصل ہوگی اس کی دولت پرستی پورے طور پر ابھر آئے گی اور ملک لوٹ دھرشٹا چار کا جنگل بن جائے گا جیسا کہ عملاً پیش آیا۔

آزادی کے بعد ملک کے پہلے وزیر اعظم جواہر لال نہرو نے کہا تھا کہ ہمارے ملک میں سب سے زیادہ جس چیز کی کمی ہے وہ سائنٹفک ٹمپر (سائنسی مزاج) ہے۔ یہ بلاشبہ ایک صحیح بات تھی۔ مگر یہ بات ان کو ۱۹۴۷ سے پہلے جاننا چاہئے تھا۔ ہمارے لیڈروں، ہندو اور مسلم دونوں پر فرض کے درجہ میں ضروری تھا کہ وہ سب سے پہلے یہ کام کریں کہ قوم سے دولت پرستی کا مزاج ختم کریں اور اس کے اندر صحیح معنوں میں سائنسی مزاج پیدا کریں۔ اگر وہ ۱۹۴۷ سے پہلے ذہنی تعمیر کا یہ کام کرتے تو آزادی بلاشبہ ہمارے لئے ایک نعمت ہوتی۔ مگر اس ابتدائی تیاری کے بغیر جب وہ آزادی لائے تو فطری طور پر یہ ہوا کہ ملک مالی بھرشٹاچار کا جنگل بن گیا۔

موجودہ زمانہ میں ایک لفظ کا بہت زیادہ چرچا کیا جاتا ہے، اور وہ دیش بھگتی ہے، میں دیش بھگتی کو ملک کی نئی تعمیر کے لئے بے حد اہم سمجھتا ہوں مگر دیش بھگتی کے شور میں مجھے کوئی سچا

دیش بھگت دکھائی نہیں دیتا۔ اپنے علم اور تجربہ کی بنیاد پر میرا شدید احساس ہے کہ ہمارے لیڈروں میں شاید کوئی ایک شخص بھی نہیں جو حقیقی معنوں میں دیش بھگت ہو۔ مجھے ہر ایک صرف خویش بھگت دکھائی دیتا ہے۔ نہ کہ دیش بھگت۔

29

یشپال ایک ہندی ناول نگار ہے انھوں نے اپنی زندگی تشدد پسند انقلابی کی حیثیت سے شروع کی۔ ۱۹۳۱ میں انگریزی حکومت نے انھیں گرفتار کرلیا۔ بعد کو وہ ایک زیرک دانشور کی حیثیت سے ابھرے۔ انھوں نے پریم چند کی روایات کو آگے بڑھایا "جھوٹا سچ" ان کا ایک بہت مشہور ناول ہے۔

اس ناول میں وہ بتاتے ہیں ۱۹۴۷ سے پہلے برصغیر ہند کے نیتاؤں نے جن نعروں پر قوم کو سرحد کے دونوں طرف اٹھایا۔ وہ سب تباہ کن نعرے تھے۔ نعروں کی اس سیاست نے پورے برصغیر کو تباہی کے سوا اور کچھ نہیں دیا۔ نیتاؤں کے نعرے صرف جھوٹے تھے جن کو سچ کے روپ میں پیش کیا گیا۔ "جھوٹا سچ" اسی کی کہانی ہے، تاہم ان کے ناول کا آخری باب پرامید الفاظ پر ختم ہوتا ہے۔ "دیش کا مستقبل چند نیتاؤں کے ہاتھ میں نہیں ہے بلکہ جنتا کے ہاتھ میں ہے۔

مگر ناول نگار کے یہ الفاظ بھی موجودہ مدت میں ایک فریب کے سوا اور کچھ نہیں۔ سوال یہ ہے کہ ہندستان کا نظام کیا وہ سو کروڑ باشندے چلائیں گے جن کو جنتا کہا جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسا نہیں ہوسکتا۔ عملی طور پر جو ہوگا وہ یہ کہ ملک میں الیکشن کرائیں جائیں گے۔ اس الیکشن میں جو لوگ جیتیں گے وہی حکومت بنا کر ملک کا نظام چلائیں گے اس کا مطلب یہ ہے کہ دوبارہ یہ نیتا ہی ہوں گے جو ملک کے حال اور مستقبل کے مالک ہوں گے نہ کہ جنتا۔

ہمارے ملک کا اصل مسئلہ یہ ہے کہ یہاں کی عام جنتا ایک بے شعور بھیڑ ہے۔ تعلیمی پس ماندگی کی بنا پر وہ نعرہ اور حقیقت کے درمیان فرق نہیں جانتے۔ وہ استحصالی الفاظ اور تعمیری الفاظ کے درمیان تمیز نہیں کرسکتے۔ جنتا کی یہی بے شعوری ہے جس نے نیتاؤں کو یہ موقع دیا کہ

وہ جھوٹ کو سچ کے روپ میں پیش کریں اور جنتا اس پر یقین کرتے ہوئے اپنا ووٹ دے۔

۱۹۴۷ سے پہلے جب مہاتما گاندھی سیاسی آزادی کا اندولن چلا رہے تھے تو ان سے کہا گیا کہ آپ ملک کو آزاد کر کے اسے جن لوگوں کے ہاتھ میں دینا چاہتے ہیں وہ اشکچھت لوگ ہیں اور آشکچھت لوگ کسی ملک کا نظام درست طور پر نہیں چلا سکتے۔ مہاتما گاندھی نے اس کے جواب میں کہا کہ میرے دیش کے لوگ اشکچھت ہیں، مگر وہ آگیانی نہیں۔ لیکن پچھلے پچاس سال کا تجربہ بتاتا ہے کہ جو لوگ آشکچھت ہوں وہ ہمیشہ آگیانی ہی ہوتے ہیں۔ گیان کے لئے شکچھا دینا اتنا ہی ضروری ہے جتنا کہ جسم کی تندرستی کے لئے غذا، یہ فطرت کا ایک اصول ہے جس میں کوئی استثنا نہیں۔

جنتا کی اس کمزوری نے ہمارے لیڈروں کو یہ موقع دیا کہ وہ بڑے بڑے الفاظ بول کر ان کا سیاسی استحصال کریں۔ جو لوگ سنجیدہ طور پر قوم کی تعمیر کرنا چاہتے ہوں وہ ہمیشہ لو پروفائل میں کلام کرتے ہیں۔ لیکن بے شعور جنتا لو پروفائل کی زبان نہیں سمجھتی۔ چنانچہ وہ ان لوگوں کے پیچھے دوڑ پڑتی ہے جو ہائی پروفائل میں بول رہے ہوں۔ سنجیدہ قائد لوگوں کے سامنے حقیقت پسندانہ پروگرام پیش کرتا ہے۔ مگر بے شعور جنتا حقیقت پسندانہ پروگرام کی اہمیت کو سمجھ نہیں پاتی۔ چنانچہ وہ ان لوگوں کے پیچھے دوڑ پڑتی ہے جو فرضی نقشے بنا کر جذباتی تقریریں کر رہے ہوں۔

یہ ساری خرابی اس لئے پیدا ہوتی ہے کہ بے شعور یا کم علم لوگ معاملات کا تجزیہ نہیں کر پاتے۔ اس لئے وہ استحصالی نیتاؤں کا شکار ہو جاتے ہیں۔ مثال کے طور پر مئی ۱۹۹۸ میں ہندستان کے موجودہ حکمرانوں نے فوجی خزانہ پر ناقابل برداشت بوجھ ڈال کر پانچ ایٹمی دھماکے کئے۔ اس پر امریکہ نے اعتراض کیا تو ہمارے لیڈروں نے کہا کہ امریکہ کو ہمارے اوپر اعتراض کرنے کا حق نہیں۔ کیونکہ ہم نے تو صرف پانچ ایٹمی دھماکے کئے ہیں، جب کہ امریکہ اب تک دو ہزار سے زیادہ ایٹمی دھماکہ کر چکا ہے۔ اس طرح ہمارے لیڈروں نے عوام کو جذباتی شراب پلا کر اتنا بے خود کر دیا کہ وہ معاملہ پر زیادہ گہرائی کے ساتھ سوچ ہی نہ سکیں۔

حقیقت یہ ہے کہ اس معاملہ میں اصل تقابل دھماکوں کی گنتی کا نہیں ہے بلکہ ہندوستان اور امریکہ کے درمیان اقتصادی فرق کا ہے۔ امریکہ نے دو سو سال تک مسلسل تعمیری عمل کر کے اپنے ملک کو اعلیٰ ترین ترقی یافتہ ملک بنادیا۔ وہاں ہر قسم کی شہری سہولتیں اتنی زیادہ ہیں کہ ہندستان سے لاکھوں لوگ حتی کہ خود ہمارے لیڈروں کے بیٹے اور بیٹیاں بھاگ بھاگ کر امریکہ پہنچ رہے ہیں۔ ایسی حالت میں ہمارے لیڈروں پر فرض ہے کہ پہلے وہ ملک کے شہریوں کو وہ تمام سہولتیں فراہم کریں جو امریکہ کے شہریوں کو حاصل ہیں۔ اس کے بعد ہی وہ ایٹمی دھماکے کر سکتے ہیں۔ موجودہ حالت میں ایٹمی دھماکہ ایک ایسا ایٹمی تعیش ہے جس کا تحمل ہندوستان جیسا غریب ملک نہیں کر سکتا۔

دہلی کے ایک صاحب نے اس معاملہ پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ دہلی میں میرے پاس اتنی پراپرٹی ہے کہ اگر میں ان سب کو بیچ دوں تو میں ایک ہوائی جہاز خرید سکتا ہوں۔ مگر میرا ہوائی جہاز خریدنا صرف اس قیمت پر ہوگا کہ اگلے دن میں اور میرے بچے بالکل بے سہارا حالت میں سڑک پر ہوں گے۔ ہندوستان کا ایٹمی دھماکہ جس اقتصادی تباہی کی قیمت پر ہوا وہ ایسا ہی ہے جیسے کوئی شخص اپنا سارا اثاثہ بیچ کر ایک ہوائی جہاز خرید لے اور فخر سے کہے کہ فلاں شخص کی طرح میں بھی ہوائی جہاز کا مالک ہو گیا، حالانکہ اس کے بعد اس کے پاس نہ رہنے کا کوئی گھر ہو اور نہ کھانے پینے کا کوئی سامان۔

30

آل انڈیا مسلم لیگ کے لیڈر چودھری خلیق الزماں (۱۸۸۸۔۱۹۷۳) ۱۹۴۷ میں فخر کے ساتھ کہا کرتے تھے کہ نہرو سے زیادہ سیاست میرا کوچوان جانتا ہے۔ چودھری خلیق الزماں اور دوسرے مسلمان لیڈر اس بھرم میں تھے کہ "مسلمان" چونکہ ہزار سال سے حکومت کرتے چلے آرہے ہیں۔ اس لئے حکومت و سیاست ان کا خاندانی ہنر بن چکا ہے۔ پاکستان بن جائے گا تو اپنے آپ ہی مسلمان اس کا نظام بہتر طور پر چلانے لگیں گے۔ مگر پاکستان کی پچاس سالہ تاریخ

ثابت کر رہی ہے کہ یہ مفروضہ مکمل طور پر بے بنیاد تھا۔

قومی یا ملی تعمیر ایک لمبا عمل ہے۔ وہ حال میں شروع ہو کر مستقبل میں اپنی تکمیل تک پہنچتا ہے۔ اس لئے قومی زندگی میں سب سے زیادہ اہمیت اس بات کی ہے کہ اس کو ایسے صاحب بصیرت لیڈر مل جائیں جو مستقبل بیں ہوں اور اپنے زمانہ میں قومی عمل کو ایسا رخ دے سکیں جو مستقبل میں مطلوب نتیجہ ظاہر کرنے والا ہو۔

۱۹۴۷ سے پہلے اس بات کی ضرورت تھی کہ قوم کو تعلیم کے رخ پر چلایا جائے کیوں کہ تعلیم ہی وہ انسان بناتی ہے جو زندگی کے کاروبار کو بہتر طور پر سنبھالنے کا اہل ہو۔ الطاف حسین حالی (وفات ۱۹۱۴) اپنے زمانے کے مسلمانوں میں ایک بدنام شخص کی حیثیت رکھتے تھے۔ معاصر مسلمان ان کو اپنے رہنما کے طور پر قبول نہ کر سکے تاہم انھوں نے اس معاملہ میں نہایت صحیح اور سچی بات کہی تھی:

بس اب وقت کا حکم ناطق یہی ہے   کہ دنیا میں جو کچھ ہے تعلیم ہی ہے

مگر ۱۹۴۷ سے پہلے کے دور میں تعلیم کے بجائے سیاسی آزادی کو زیادہ اہمیت دے دی گئی۔ اس غلط ترجیح کا بھیانک نتیجہ یہ نکلا کہ ایک عظیم ملک ایک ایسی بھیڑ کے ہاتھ میں آگیا جس کو یہ معلوم ہی نہ تھا کہ اس کے نظام کو کس طرح چلانا ہے۔

آزادی کے بعد سب سے زیادہ اہمیت اس بات کی تھی کہ ملک میں بہترین مواقع کار پیدا کئے جائیں تاکہ ہر آدمی کو اپنے ترقیاتی حوصلوں کی تکمیل کے اسباب ملتے چلے جائیں۔

مگر آزادی کے بعد جس قیادت کے ہاتھ میں ملک کا سیاسی اختیار ملا وہ ایک بے شعور قیادت تھی۔ اس نے انتہائی نادانی کے ساتھ یہ کیا کہ زندگی کے تمام شعبوں کو حکومت کے کنٹرول میں لینے کو سب سے اہم کام سمجھ لیا۔ اس نے دیو پیکر پبلک سکٹر (صحیح تر لفظ میں سرکاری سکٹر) قائم کئے۔ ہر سرگرمی کے لئے سرکاری پرمٹ اور سرکاری لائسنس کو ضروری بنا دیا۔ سماجی فلاح کے نام پر ایسے غیر فطری قوانین بنائے کہ جے آر ڈی ٹاٹا کے الفاظ میں ایک کمپنی کا مالک اپنی

بیوی کو طلاق دے سکتا ہے۔ مگر وہ اپنے ایک کارکن کو برخواست نہیں کر سکتا۔"

ٹاٹا کا اشارہ اس صورت حال کی طرف تھا کہ لیبر کے حقوق کے تحفظ کے نام پر ایسے قوانین اور ضابطے بنائے گئے جو مکمل طور پر لیبر کے حق میں تھے۔ ہمارے حکمرانوں نے اپنے سوشلسٹ ذہن کی بنا پر یہ فرض کر لیا کہ کمپنی کا مالک لازماً ظالم ہوگا اور کمپنی کا ملازم لازماً مظلوم۔ چنانچہ انھوں نے آزادی کے بعد ایسے قوانین اور ضابطے بنائے جو یک طرفہ طور پر ملازمین کے موافقت میں تھے یہ قوانین ملازمین کے حق میں اندھا ہتھیار بن گئے ہیں جن کے ذریعہ وہ اقتصادی ادارہ کو اکسپلائٹ کریں اور اقتصادی ادارے بے بسی کے ساتھ اس کا تماشہ دیکھتے رہیں۔ مزید یہ کہ تحفظِ حقوق کے اس سوشلسٹ نظریہ کا نتیجہ یہ نکلا کہ اقتصادی عمل سے مسابقت کا عنصر ختم ہو گیا۔ ان غیر فطری قوانین نے کروڑوں لوگوں کو اس بات سے بے خوف بنا دیا کہ ان کے جاب کو ختم کیا جا سکتا ہے۔ انھیں یقین ہو گیا کہ وہ ڈیوٹی ادا کئے بغیر بھی اپنے حقوق کو پا سکتے ہیں۔ اس طرح ان نام نہاد قوانین نے ملک کے کروڑوں لوگوں کو کاہل بنا دیا اور ڈیوٹی کی اہمیت کا احساس ان کے اندر سے ختم کر دیا۔

31

ملک کی تقسیم کی تحریک ایک غیر فطری تحریک تھی۔ مزید یہ کہ وہ انتہائی غیر فطری انداز میں چلائی گئی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس کا نقصان واقعی نقصان سے کئی گنا زیادہ ہو گیا۔

تقسیم بذات خود کوئی گناہ کی بات نہیں۔ مگر کوئی کام حتی کہ کھانا اور پینا بھی اگر غلط طریقہ سے کیا جائے تو وہ آدمی کے لئے نقصان کا سبب بن جائے گا۔ یہی معاملہ تقسیم کے ساتھ پیش آیا۔

۱۔ پہلی بات یہ کہ تقسیم کی تحریک کسی ایجابی سوچ کے تحت نہیں اٹھی وہ تمام تر رد عمل کے تحت اٹھی۔ کچھ ہندوؤں کے فرقہ وارانہ تحریک نے مسلمانوں میں جوابی فرقہ واریت پیدا کی۔ اور اس نے آخر کار تقسیم کی تحریک کا رخ اختیار کر لیا۔ اس تحریک کے سب سے بڑے قائد

زبردست نیشنلسٹ اور لمبی مدت تک کانگریسی تھے۔ بعض واقعات کی بنا پر وہ کانگریسی قائدین سے غصہ ہو گئے اور آل انڈیا مسلم لیگ میں شامل ہو کر تقسیم کی تحریک کے علمبردار بن گئے۔

رد عمل کی نفسیات کے تحت جو تحریک شروع کی جائے وہ منفی نتائج تو ضرور پیدا کر سکتی ہے مگر وہ مثبت نتائج کا سبب نہیں بن سکتی۔ یہی پاکستان کے ساتھ پیش آیا۔

۲۔ تقسیم کے بعد پاکستان عملاً جہاں بننے والا تھا وہ مسلم اکثریت کا علاقہ تھا۔ مگر یہ تحریک زیادہ تر ان علاقوں میں چلائی گئی جہاں مسلمان اقلیت کی حیثیت رکھتے تھے۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ اکثریتی علاقہ کے مسلمان اپنے ہندو بھائیوں کے ساتھ مل جل کر رہ رہے تھے۔ ان کے یہاں "ہندو مسئلہ" نام کی کوئی چیز موجود نہ تھی۔ اس لئے ان کے درمیان تقسیم کی تحریک پنپ نہ سکی۔ البتہ مسلم اقلیت والے علاقے کے مسلمان ہندو کی طرف سے عدم تحفظ کے احساس میں مبتلا تھے۔ اس لئے یہاں اس تحریک کو مفید میدان مل گیا۔ مگر تحریک کا یہ انداز خطرناک حد تک غیر فطری تھا۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ پاکستان عملاً مسلم اکثریت کے علاقہ میں بنا مگر اس کی قیمت تمام تر اس علاقہ کے مسلمانوں کو دینی پڑی جہاں وہ اقلیتی حیثیت رکھتے تھے کیوں کہ اسی علاقہ میں پاکستانی تحریک کی دھوم مچائی گئی تھی۔

۳۔ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ پاکستان کی تحریک کی قیادت مسٹر طبقہ نے کی۔ علماء کا طبقہ تقریباً ۹۹ فیصد اس سے الگ رہا۔ بالفاظ دیگر پاکستان کی تحریک ایک قومی اور مادی تحریک تھی۔ وہ کسی بھی درجہ میں کوئی مذہبی یا اسلامی تحریک نہ تھی۔ مگر عوام کا استحصال کرنے کے لئے مسلسل طور پر اس کے حق میں اسلام کا نام استعمال کیا گیا۔ اس کی حمایت میں یہ لفظی نعرہ وضع کیا گیا کہ: پاکستان کا مطلب کیا، لا الہ الا اللہ۔

ایک قومی تحریک کو اسلامی تحریک بنانا سراسر دو عملی کا ایک فعل تھا۔ یہ وہی چیز تھی جس کو شریعت کی زبان میں منافقت کہا جاتا ہے۔ یہ منافقانہ سیاست کا ایک ایسا واقعہ ہے جس کی کوئی دوسری مثال اسلام کی پوری تاریخ میں نہیں ملتی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ منافقانہ روش پاکستان

کی تمام پالیسیوں کا اہم ترین عنصر بن گیا۔ ہر غیر دینی کام کو دینی اصطلاح میں بیان کرنا پاکستان کے دانشوروں کا کمال قرار پایا۔ اسلام کی پوری تاریخ میں میرے علم کے مطابق، کوئی بھی مسلم گروہ ایسا نہیں جس نے منافقت ہی کو اپنی تمام پالیسیوں کی بنیاد بنایا ہو۔ تقسیم کے نتیجہ میں بننے والا مسلم ملک ہی اس کی واحد تاریخی مثال ہے جس کو برعکس طور پر پاکستان کہا جاسکتا ہے۔

۴۔ پاکستان جب بنا تو لیڈروں کی ناعاقبت اندیشانہ سیاست کے نتیجہ میں سرحد کے دونوں طرف بھیانک فسادات پھوٹ پڑے۔ لوٹ مار اور قتل و غارتگری کا زبردست سلسلہ شروع ہو گیا۔ اس کے نتیجہ میں نفرت کی ایک خونیں فصل اگ آئی۔

تقسیم کے بعد سرحد کے دونوں طرف عرصہ دراز تک لوگ زبان اور قلم کے ذریعہ اس کی خونیں داستانیں دہراتے رہے۔ اس داستان سرائی کا بدترین پہلو یہ تھا کہ پاکستان میں لکھی جانے والی کتابوں میں صرف ان واقعات کا تذکرہ تھا جو بوقت تقسیم ہندوؤں نے مسلمانوں پر کئے۔ اور انڈیا میں لکھی جانے والی کتابوں میں صرف ان واقعات کا تذکرہ تھا جس میں ہندو مسلمانوں کے ظلم کا شکار ہوئے۔ مکمل رپورٹنگ کی جاتی تو دونوں کے درمیان توازن قائم رہتا مگر مذکورہ قسم کی یکطرفہ رپورٹنگ نے سرحد کے دونوں طرف نفرت اور عداوت کی آگ بھڑکا دی جو کسی طرح ختم ہوتی ہوئی نظر نہیں آتی۔

۵۔ پاکستان کی بنیاد اگر اسلام پر ہوتی تو وہاں اپنے پڑوسیوں کے لئے محبت اور خیر خواہی کا جذبہ ابھرتا کیونکہ اسلام دوسری قوموں کو اپنا مدعو سمجھتا ہے۔ اور مدعو کے حق میں ہمیشہ محبت کی نفسیات پیدا ہوتی ہے نہ کہ عداوت کی نفسیات۔ مگر پاکستان کی بنیاد باعتبار حقیقت اسلام تھی ہی نہیں۔ پاکستان ہندوؤں سے قومی نفرت کی بنیاد پر بنا اسی کا یہ لازمی نتیجہ تھا کہ پاکستان بننے کے بعد وہاں رات دن ہندو اور بھارت کے خلاف نفرت کا پروپیگنڈہ ہونے لگا۔ بھارت کا لفظ پاکستانی زبان میں، ایک نفرت انگریز چیز کی ہم معنی بن گیا۔ پاکستانی علماء اور دانشوروں کا ذہن یہ بن گیا کہ پاکستان کی بقا اور اس کے استحکام کے لئے ضروری ہے کہ ہر پاکستانی کو بھارت سے متنفر کر دیا جائے۔

پچھلے پچاس سال میں پاکستان کی ہر تقریر و تحریر بھارتی نفرت سے بھری ہوئی نظر آتی ہے۔ یہ بلاشبہ ایک عظیم نقصان ہے۔ کیونکہ کوئی قوم نفرت کی بنیاد پر نہ کھڑی ہو سکتی ہے اور نہ ترقی کر سکتی ہے۔

۶۔ تقسیم کا مطلب علیحدگی ہے۔ دو بھائیوں میں جائداد کی تقسیم ہو تو دونوں کی فلاح اس میں ہے کہ اول دن ہی ہر چیز کا کامل بٹوارہ ہو جائے۔ تجربہ بتاتا ہے کہ خاندانی بٹوارہ کے بعد اگر ایک درخت بھی متنازع رہ جائے تو اس پر بھی لڑائی شروع ہو جاتی ہے جو دونوں کو تباہ کر کے رکھ دیتی ہے۔

پاکستان کے قائدین کے لئے فرض کے درجہ میں ضروری تھا کہ وہ اس حقیقت کو جانیں اور ۱۵ر اگست ۱۹۴۷ ہی کو اس طرح مکمل طور پر الگ ہو جائیں کہ اس کے بعد کوئی بھی چیز غیر منقسم حالت میں باقی نہ رہے۔ مگر اس سنگین حقیقت کو نہ پاکستانی قائدین نے سمجھا اور نہ ہندوستانی قائدین نے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ تقسیم کے باوجود کشمیر کی ریاست نزاعی حالت میں پڑی رہی۔

یہ بلاشبہ دونوں طرف کے قائدین کے لئے ایک ہمالیائی غلطی تھی۔ اگر یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ انڈیا اور پاکستان دونوں ہی کے وسائل کا پچاس فیصد سے زیادہ حصہ کشمیر کے نزاع پر قربان ہو رہا ہے۔ پچاس سال گذرنے کے باوجود یہ مسلسل تباہی ختم ہوتی ہوئی نظر نہیں آتی۔

دونوں ملکوں کے قائدین کا یہ اہم ترین فرض تھا کہ تقسیم کے وقت ہی وہ کسی بھی صورت میں اس مسئلہ کا مکمل خاتمہ کر دیتے۔ مگر دونوں میں سے کسی بھی ملک کی قیادت نے اس معاملہ میں تدبر کا ثبوت نہیں دیا۔ پاکستان کے سابق وزیر اعظم ذوالفقار علی بھٹو نے بعد از خرابی بسیار ۱۹۷۲ء میں وہ معاہدہ کیا جس کو عام طور پر شملہ ایگریمنٹ کہا جاتا ہے۔ اس معاہدہ کے تحت پاکستانی وزیر اعظم نے بلااعلان یہ مان لیا تھا کہ قبضہ کی لائن (LoC) دونوں ملکوں کے درمیان تسلیم شدہ سرحد ہو گی۔

پاکستان کے لوگوں نے اگر ۱۹۷۲ کے اس معاہدے کو دل سے مان لیا ہوتا تو پچھلے پچیس

سال میں پاکستان نے اتنی ترقی کی ہوتی کہ اس کے عوام کشمیر کو بھول جاتے۔ مگر پاکستانی حکمرانوں نے کاغذ پر تو دستخط کر دیئے مگر وہ اس کو اپنی عملی پالیسی نہ بنا سکے۔ ۱۹۷۲ کے بعد پاکستان میں ایک نئی تاریخ بننے والی تھی مگر وہ بنتے بنتے رہ گئی۔

32

۱۹۴۷ سے پہلے کے دور میں ایک انقلابی شاعر نے ایک نظم لکھی جس کا ایک شعر یہ تھا:

برج محن سے نکلا سورج　　　　روشن اپنا مستقبل ہے

اس تصور کو لیکر طفیل احمد منگلوری نے ایک کتاب لکھی۔ جس کا نام انھوں نے روشن مستقبل رکھا یہ کتاب اس زمانہ میں بہت مقبول ہوئی۔ اس واقعہ کے تقریباً ۶۰ سال بعد یکم جون ۱۹۹۸ کو میں آل انڈیا نشریات سن رہا تھا۔ اس تاریخ کو بھاجپا گورنمنٹ کے وزیر مالیات مسٹر یشونت سنہا نے ۹۹-۱۹۹۸ کا بجٹ پیش کیا۔ اپنی بجٹ اسپیچ انھوں نے اس جملے سے شروع کی کہ آج ایک نیا انڈیا ابھر رہا ہے:

A new India is rising.

انھوں نے کسی قدر جوش کے ساتھ کہا کہ ۱۱ر مئی کو پوکھرن سے جو سفر شروع ہوا وہ پیچھے جانے والا نہیں، میں نے سوچا کہ اپنی نوجوانی کی عمر سے اب تک میں باربار مختلف لفظوں میں یہ بات سنتا رہا ہوں۔ مگر آج تک یہ الفاظ واقعہ نہیں بنے۔ نہ سورج نے نکل کر ہماری تاریکیوں کو روشن کیا اور نہ نئے انڈیا کا محل تعمیر ہو سکا۔ بظاہر مستقبل قریب تک اس کی کوئی امید نہیں۔

اس ناکامی کی وجہ کیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہمارے رہنما ایک چیز سے ایسی امید باندھتے رہے ہیں جس سے اس کا حصول ممکن ہی نہیں تھا۔ ۱۹۴۷ سے پہلے لوگوں نے جس چیز کو روشن مستقبل سمجھا تھا اس کا تعلق صرف سیاسی تبدیلی سے تھا۔ لوگ سمجھتے تھے کے انگریزی راج کا ختم ہونا ملک کے افق پر نئی صبح کا طلوع ہونا ہے۔ حالانکہ محض پولیٹیکل ٹیم کی تبدیلی کسی قوم کے لئے روشن مستقبل کی ضمانت نہیں اسی طرح اب ۱۹۹۸ میں ایٹمی دھماکہ کے بعد نئے انڈیا کی

باتیں کی جا رہی ہیں۔ مگر یہ بھی محض ایک فرضی امید ہے۔ ایٹمی دھماکہ کا تعلق ایک ایسی سرگرمی سے ہے جو اپنی نوعیت کے اعتبار سے تمام تر سلبی ہے اور ایک سلبی سرگرمی سے خواہ بظاہر وہ کتنا ہی بڑی ہو، کوئی ایجابی نتیجہ برآمد ہونے والا نہیں۔ اس قسم کی ایٹمی سرگرمی صرف وسائل کو کھانے والی ہے نہ کہ وسائل کو مفید چیزوں میں تبدیل کرنے والی۔

روشن مستقبل یا نئے انڈیا کا ظہور جس چیز پر منحصر ہے وہ وسیع تر سماجی تبدیلی ہے نہ کہ محض سیاسی تبدیلی۔ پھیلے ہوئے ملک کے قدرتی ذرائع مثبت مقاصد کے لئے استعمال ہوں۔ ایسی پلاننگ کی جائے جس کے نتیجہ میں لوگوں کو صاف پانی اور تازہ ہوا مل سکے۔ ملک کو ایسا اڈمنسٹریشن دیا جائے جس کے تحت دفتروں میں رشوت کے بغیر کام ہو۔ عدالتوں میں ایک عام آدمی کو انصاف ملے، سڑک، بجلی، ٹیلی فون اور دوسری ضروری چیزیں معیاری صورت میں دستیاب ہوں۔ ریل اور ٹرانسپورٹ کے شعبے اس طرح منظم ہوں کہ لوگوں کے لئے محفوظ اور بروقت سفر کرنا ممکن ہو جائے۔ اسپتالوں میں ہر آدمی بہ آسانی اپنا علاج پا سکے۔ مگر ان چیزوں کا تعلق نہ ایٹمی دھماکہ سے ہے اور نہ سیاسی گدی پر ایک کو ہٹا کر دوسرے کو بٹھانے سے۔

میرے جیسے ایک آدمی کو مذکورہ قسم کے الفاظ سے کوئی خوشی نہیں ہوتی۔ میری بوڑھی آنکھیں ملک میں تعمیر و ترقی کا ایک حقیقی عمل دیکھنا چاہتی ہیں۔ مگر بدقسمتی سے ابھی تک اس کا آغاز بھی نہیں ہوا۔

33

ہندستان نے بھارتیہ جنتا پارٹی کی سیاسی قیادت کے تحت پانچ ایٹمی دھماکے کیے۔ یہ دھماکے ۱۱ر مئی اور ۱۳ر مئی ۱۹۹۸ء کو پوکھرن (راجستھان) میں کیے گئے۔ اس کے بعد پاکستان میں اس کا ردّ عمل ہوا۔ پاکستانی عوام کی طرف سے شدید مطالبہ ہونے لگا کہ پاکستان کو بھی اس کے جواب میں ایٹمی دھماکہ کرنے چاہیے۔ یہ معاملہ پر شور طور پر عالمی میڈیا میں گونجتا رہا۔ امریکہ نے اصرار کے ساتھ کہا کہ پاکستان خاموشی اختیار کر لے اور ہندستان کے جواب میں ایٹمی دھماکہ نہ

کرے۔امریکی حکومت نے کہاکہ دھماکہ کرنے کی صورت میں پاکستان کے خلاف سخت اقتصادی پابندیاں عائد کی جائیں گی اور دھماکہ نہ کرنے کی صورت میں نہ صرف اس کی اقتصادی مدد جاری رہے گی بلکہ اس کو "ایٹمی چھتری" بھی دی جائے گی۔ تاکہ اس کے لئے ہندستانی حملہ کا خطرہ باقی نہ رہے۔ آسٹریلیا نے یہ تجویز پیش کی کہ پاکستان اگر ایٹمی دھماکہ نہ کرے تو ترقی یافتہ ممالک اس کی امداد کی رقم کو دوگنا کردیں۔

مگر پاکستان کے وزیراعظم نواز شریف کے لئے یہ زندگی اور موت کا مسئلہ تھا۔پاکستان کے جذباتی عوام کا یہ مطالبہ اتنا شدید تھا کہ اس کو نہ ماننے کی صورت میں یقینی طور پر اتنا ہنگامہ کھڑا ہوتا کہ نواز شریف کی حکومت ختم ہو جاتی۔ کئی دن کے متضاد خبروں کے بعد آخر کار ۲۸ر مئی ۱۹۹۸ء کی شام کو پاکستانی وزیراعظم نواز شریف نے ٹی وی پر اعلان کیا کہ آج شام چار بجے ہم نے بلوچستان کے صحرا میں پانچ ایٹمی دھماکہ کئے ہیں۔اگلے دن پاکستان نے ایک اور ایٹمی دھماکہ کیا۔اس دھماکہ کے فوراً بعد امریکہ اور دوسرے ترقی یافتہ ملکوں نے اعلان کردیا کہ وہ پاکستان کی اقتصادی امداد کو فوری طور پر بند کررہے ہیں۔

پاکستان کے اس دھماکہ کے بعد امریکی صدر بل کلنٹن نے شدید رنج کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ پاکستان نے ایک نہایت قیمتی موقع (Priceless opportunituy) کھودیا۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ تبصرہ بالکل درست تھا بدقسمتی سے پاکستان میں جتنے بھی لیڈر پیدا ہوئے، ابتدائی قائد سے لے کر آخری قائد تک، ہر ایک پاکستانی مسلمانوں کو جذباتی شراب پلاتا رہا۔پاکستان کے تمام علماء اور دانشور وہاں کے لوگوں کو فخر کی خوراک دیتے رہے۔اسی بگڑے ہوئے مزاج کا یہ نتیجہ تھا کہ پاکستان کے یہ عوام وخواص اپنی تاریخ کے اس انتہائی فیصلہ کن موقع پر جذبات کی رو میں بہہ گئے۔وہ معاملات میں حقیقت پسندانہ رائے قائم کرنے سے قاصر رہے۔

پاکستان کے لوگ اگر سوج بوجھ سے کام لیتے تو یقیناً وہ جان لیتے کہ ہندستان کے ایٹمی دھماکہ کا جواب دوبارہ ایٹمی دھماکہ نہیں ہے۔بلکہ اس کا زیادہ موثر جواب یہ ہے کہ عالمی رائے کا

احترام کیا جائے۔ اگر پاکستان کو ہندستان کی طرف سے ایٹمی حملہ کا خطرہ تھا تو اس کا زیادہ کارگر حل یہ تھا کہ امریکہ کے پیشکش کے مطابق اس کی طرف سے فراہم کردہ ایٹمی چھتری کو قبول کرلیا جائے، جیسا کہ جاپان نے قبول کرر کھا ہے، اس کے مقامی وسائل اور عالمی ادارہ کے ذریعہ ملک کی اقتصادی اور تعلیمی ترقی کا کام پوری توجہ کے ساتھ شروع کر دیا جائے۔ پاکستان اگر اس حقیقت پسندانہ منصوبہ پر عمل کرتا تو دس سال میں وہ اتنی زیادہ ترقی کرلیتا۔ کہ ایٹمی دھماکہ کے بغیر ہی وہ ایک ناقابل تسخیر طاقتور ملک بن جاتا۔

حقیقی لیڈرشپ وہ ہے جو اپنی قوم کو حقیقت پسند بنائے۔ اس کے برعکس جو قیادت اپنی قوم کو جذباتیت کی خوراک دے وہ سرے سے قیادت ہی نہیں۔

صاحب بصیرت لوگ جانتے ہیں کہ کسی ملک کے لئے دفاع کا مسئلہ ہو تب بھی اس کا حل عوام کو ایجوکیٹ کرنا ہے نہ کہ مہلک ہتھیاروں کا ذخیرہ اکٹھا کرنا۔ ۹؍جولائی ۱۹۹۸ء کو نئی دہلی کے مالینکر ہال میں ایک جلسہ تھا۔ موجودہ ہندوستانی وزیر اعظم اٹل بہاری واجپائی بطور چیف گیسٹ وہاں موجود تھے۔ وزیر اعظم نے اپنی تقریر میں ہندستان کے ایٹمی دھماکہ کو ڈیفنس کی ایک اعلیٰ تدبیر کے طور پر پیش کیا۔ انھوں نے کہا کہ پوکھرن کے ایٹمی دھماکے نے ساری دنیا کو ہلا دیا ہے۔

پروفیسر یشپال نے بھی اس موقع پر تقریر کی انھوں نے وزیر اعظم کا حوالے دیئے بغیر کہا کہ دفاع سمیت ہر مسئلہ کا ایک ہی حل ہے، اور وہ ہے قوم کو اعلیٰ تعلیم یافتہ بنانا۔ انھوں نے اس کی تفصیل کرتے ہوئے کہا کہ تعلیم سب سے زیادہ اعلیٰ دفاع ہے:

No defence is higher then education

بدقسمتی سے زندگی کی اس حقیقت کا علم نہ ہندستان کے لیڈروں کو ہے اور نہ پاکستان کے لیڈروں کو۔

34

۲۸؍مئی ۱۹۹۸ کو پاکستان نے اپنے اعلان کے مطابق، ایک ہی دن پانچ ایٹم ٹسٹ کئے

تھے۔ ۳۰؍ مئی ۱۹۹۸ء کو حکومت پاکستان نے اعلان کیا کہ آج اس نے بلوچستان کے ریگستان میں ایک اور ایٹمی ٹسٹ کیا ہے۔ اس کے آخری دھماکہ کی طاقت ہیروشیما میں گرائے جانے والے ایٹم بم (۱۹۴۵) کے مقابلہ میں دوگنا تھی۔ اس طرح پاکستان نے انڈیا کے پانچ ایٹمی دھماکہ کے مقابلہ میں چھ ایٹمی دھماکے کیئے۔

۳۰؍ مئی کے اس دھماکہ کے بعد پاکستانی حکومت نے اعلان کیا کہ اب ہم نے دوبارہ اس علاقہ میں طاقت کا وہ توازن قائم کر لیا ہے جو ہندستان کے ایٹمی دھماکہ کے بعد ٹوٹ گیا تھا۔ مگر کیا ایٹمی دھماکہ اس مسئلہ کا حل ہے۔ تاریخ کا جواب یہ ہے کہ ہر گز نہیں۔

ٹھیک اسی قسم کی صورت حال امریکہ اور سوویت یونین کے درمیان پیش آچکی ہے۔ دوسری عالمی جنگ کے دوران ۱۹۴۵ میں جب امریکہ نے ہیروشیما اور ناگاساکی پر اپنے ایٹم بم کا تجربہ کیا تو اس کے بعد سوویت یونین کے لیڈروں نے کہا کہ اب فوجی طاقت کا توازن امریکہ کے حق میں چلا گیا ہے۔ اس لئے ہم کو بھی ایٹم بم اور ہائیڈروجن بم بنانا چاہیئے۔ سوویت یونین جس کا رقبہ اس وقت ہندستان اور پاکستان سے زیادہ تھا اس نے اپنے تمام اقتصادی وسائل ایٹمک ریسرچ اور ایٹم بم کی تیاری میں لگادیئے یہاں تک کہ اس کے وسیع اسلحہ خانہ میں ۲۹ ہزار چھوٹے بڑے ایٹم بم بن کر اکٹھا ہو گئے۔

اب سوویت یونین اس پوزیشن میں تھا کہ امریکہ سمیت اپنے تمام دشمنوں کو اسی طرح تباہ کردے جس طرح ہیروشیما تباہ ہوا تھا۔ مگر انتہائی نازک حالات کے باوجود سوویت یونین اپنا ایک بم بھی اپنے دشمنوں کے خلاف استعمال نہ کر سکا۔ یہاں تک کہ ۱۹۹۱ میں سوویت یونین ٹوٹ گیا۔ ایٹم بموں کا ذخیرہ اس کے لئے اپنی سپر پاور حیثیت کو بچانے میں کامیاب نہیں ہوا۔

اس کھلی ہوئی قریبی مثال سے انڈیا اور پاکستان کے سیاسی لیڈروں نے کوئی سبق نہیں لیا۔ دونوں میں سے ہر ایک یہ اعلان کر رہا ہے کہ ہم سلف ڈیفنس کے لئے ایٹم بم اور ہائیڈروجن بم بنا رہے ہیں۔ حالانکہ حقیقی واقعات یہ ثابت کر رہے ہیں کہ ایٹم بم کا کوئی بھی تعلق سلف ڈیفنس

سے نہیں ہے بلکہ اس کا تعلق صرف سلف ڈسٹرکشن (خود تخریبی) سے ہے۔ایٹم بم اگر استعمال ہوں تب بھی وہ ہلاکت ہیں اور اگر وہ استعمال نہ ہوں تب بھی ہلاکت۔

انڈیا اور پاکستان کے لیڈروں کو یہ خبر نہیں کہ ایٹم بم اگر بالفرض استعمال ہوں تب بھی ان کی زد میں صرف حریف قوم نہیں آتی بلکہ خود استعمال کرنے والا بھی ان کے غیر معمولی نقصانات کے زد میں آجاتا ہے۔ایٹمی جنگ بلاشبہ ایک بوم رینگ (boomerang) کھیل ہوگا۔ کیوں کہ اس کے نتیجہ میں نہ صرف زیر نشانہ پڑوسی ملک تباہ ہوگا بلکہ خود ایٹم بم مارنے والا ملک بھی یقینی طور پر اس کے زد میں آجائے گا۔ایٹم بم گرانے کے بعد جو تابکاری (tadiactivity) پھیلے گی، فضائی کثافت میں جو اضافہ ہوگا، سمندروں کا پانی جس طرح زہر آلود ہوگا اور ان سب کے نتیجہ میں جو بیماریاں پھیلیں گی، دونوں ملک یکساں طور پر اس کی لپیٹ میں آجائیں گے۔

تاہم ایٹم بم اگر استعمال نہ ہوں وہ بنا بنا کر صرف رکھے جاتے رہیں تب بھی وہ ناقابل بیان حد تک ہلاکت خیز ہیں۔اس کے نتیجہ میں جو طرح طرح کے مسائل پیدا ہوتے ہیں۔ان میں ایک مسئلہ یہ ہے کہ وہ اتنی مہنگی قیمت پر تیار ہوتے ہیں کہ پورے ملک کی اقتصادی حالت تباہ و برباد ہو جائے، چیزوں کی قیمت میں بے پناہ اضافہ، ضروری اشیا کی شدید قلت، چیزوں میں ملاوٹ کا طوفان، حتی کہ تازہ پانی اور صاف ہوا جیسی چیزوں کے حصول کا بھی مشکل ہو جانا۔

حقیقت یہ ہے کہ کسی قوم کے لئے ایٹمی طاقت بننا ہولناک حد تک اس کی اقتصادی کمزوری پر منتج ہوتا ہے۔اس کا کھلا ہوا نمونہ سوویت یونین (موجودہ روس) کو اس صورت میں دیکھا جاسکتا ہے۔جو ملک ۱۹۹۰ تک سپر پاور سمجھا جاتا تھا۔وہ آج اقتصادی اعتبار سے ایک تباہ شدہ ملک بن چکا ہے۔میں نے خود اپنے ایک سفر کے دوران سوویت یونین کی یہ تباہ حالت دیکھی ہے۔جس کو میں اپنے سفر نامہ میں لکھ چکا ہوں۔(سفر نامہ روس، مطبوعہ الرسالہ فروری۔مارچ ۱۹۹۱)

کہا جاتا ہے کہ ایٹمی ہتھیار مانع جنگ کی حیثیت رکھتے ہیں اور اس طرح وہ امن کی

ضمانت (پیش گارنٹر) ہیں۔ مگر یہ ایک شدید مغالطہ ہے۔ امریکہ اور سوویت یونین کا تجربہ بتاتا ہے کہ جب دونوں ملکوں نے ایٹمی مانع کی صلاحیت حاصل کرلی تو صرف یہ ہوا کہ دونوں میں براہ راست فوجی ٹکراؤ کا امکان ختم ہو گیا۔ اور اس کے بجائے وہ ٹکراؤ شروع ہو گیا جس کو مخفی جنگ (covert war) کہا جاتا ہے۔ کولڈ وار اور پراکسی وار اسی کی صورتیں ہیں۔ دوسری قسم کی جنگ جو امریکہ میں اور سوویت یونین کے درمیان جاری ہوئی، ۱۹۹۱ تک اس کے تحت دنیا کے مختلف حصوں میں تقریباً دو کروڑ انسان ہلاک ہو گئے۔ گویا ایٹمی ہتھیار جنگ کو روکنے والا نہیں ہے۔ بلکہ وہ صرف یہ کرتا ہے کہ جنگ کے میدان کو بدل دیتا ہے۔

جنگ کیوں ہوتی ہے۔ جنگ کا اصل سبب دو گروہوں کے درمیان دشمنی کی نفسیات ہے۔ جب دلوں میں دشمنی کے جذبات موجود ہوں تو کوئی ہتھیار جنگ کو بند نہیں کرتا، وہ صرف جنگ کی صورت کو بدل دیتا ہے، اس طرح اکثر حالات میں جنگی ٹکراؤ اور زیادہ شدید ہو جاتا ہے۔ اس کا نمونہ ہمیں انڈیا اور پاکستان کے درمیان بھی نظر آتا ہے۔ مئی ۱۹۹۸ میں جب دونوں ملکوں نے اس بات کا مظاہرہ کیا کہ انھوں نے ایٹمی ہتھیار بنالئے ہیں تو اس کے بعد ہی سرحد پر متشددانہ سرگرمیاں بڑھ گئیں۔ بم اور گن کے استعمال میں پہلے سے زیادہ اضافہ ہو گیا۔

35

پاکستان نے نواز شریف حکومت کے تحت ۲۸ مئی اور ۳۰ مئی کو مجموعی طور پر چھ ایٹمی دھماکے کیے۔ بالفاظ دیگر، یہ ثابت کیا کہ وہ ایٹم بنانے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ یہ ایٹمی دھماکے ہندستان کے جواب میں کیے گئے جو ۱۱ مئی اور ۱۳ مئی ۱۹۹۸ کو پانچ کی تعداد میں کیے گئے تھے۔

اس کے بعد ایران کے وزیر خارجہ مسٹر کمال خرازی پاکستان آئے۔ ۲ جون ۱۹۹۸ کو انھوں نے اس کے بارے میں کہا کہ پاکستان کے کامیاب ایٹمی دھماکہ نے ساری دنیا کے مسلمانوں کو نیا اعتماد عطا کیا ہے۔ ملیشیا کے مسلم لیڈر انور ابراہیم کا تاثر اس سے مختلف تھا۔ انھوں نے انڈیا اور پاکستان دونوں ملکوں پر تنقید کرتے ہوئے کہا کہ یہ دھماکے دونوں ملکوں کے غریب لوگوں کی

قیمت پر کیے گئے ہیں:

It is a nuclear adventurism on the cost of poor people of both the country.

میں سمجھتا ہوں کہ اس معاملہ میں انور ابراہیم کا تبصرہ ہی زیادہ درست ہے۔ کسی قوم کے اعتماد اور طاقت کا راز یہ نہیں ہے کہ اس کے پاس ایٹم بموں کا ذخیرہ ہو، اگر ایسا ہوتا تو سوویت یونین کبھی نہ ٹوٹتا جس کے پاس ہندوستان اور پاکستان کے مقابلہ میں ہزاروں گنا زیادہ ایٹم بم تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ قومی اعتماد اور قومی طاقت کا راز یہ ہے کہ ملک میں سماجی امن ہو۔ ضرورت کی چیزیں مناسب قیمت پر مل رہی ہوں۔ شہری سہولتیں ہر ایک کو بخوبی طور پر پہنچ رہی ہوں۔ تعلیم اور علاج کا عمدہ انتظام ہو، دفتروں میں رشوت کے بغیر کام ہوتا ہو۔ وغیرہ۔

موجودہ صورتحال یہ ہے کہ انڈیا اور پاکستان دونوں انتہائی غریب ملک ہیں۔ جہالت سے لے کر بھرشٹاچار تک ہر قسم کی برائیوں نے عام انسان کی زندگی کو مصیبت بنا رکھا ہے۔

ایسی حالت میں ان ملکوں میں ایٹم بم بنانا دراصل لوگوں کو غریب اور بدحال رکھ کر قومی دولت کو ایٹمی دھماکوں میں تباہ کرنا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ عمل اتنا زیادہ تباہ کن ہے کہ کسی ملک کے عوام بھی اس کو برداشت نہیں کر سکتے۔ مگر سطحی قسم کے لیڈر عوام کو نفرت اور جوش کی شراب پلا کر اس طرح بدہوش کر دیتے ہیں کہ وہ اپنے فائدہ اور نقصان کو بھی سمجھ نہیں پاتے۔ ان کا نشہ صرف اسی وقت اترتا ہے جب کہ بربادی اپنی آخری حد تک پہنچ چکی ہو اور سرے سے واپس لوٹنے کا امکان ہی باقی نہ رہے۔

دونوں ملک دفاع کے نام پر ایٹمی دھماکہ کر رہے ہیں۔ مگر دفاع کا کوئی تعلق ایٹم بم سے نہیں۔ اس سلسلے میں سب سے اہم بات یہ ہے کہ ایٹم بم جیسی ہلاکت خیز چیز تاریخ میں صرف ایک بار استعمال ہوتی ہے۔ پھر جب ایک بار استعمال کیے جانے کے بعد ایٹم بم کے مزید استعمال کے خلاف عالمی سطح پر ایک طاقتور مانع (Deterrent) قائم ہو چکا ہو، تو اس پر نہ ہونے والے حملہ

سے دفاع کی آخر کیا ضرورت۔

36

مئی ۱۹۹۸ء سے پہلے تک یہ سمجھا جاتا تھا کہ دنیا میں مبینہ طور پر پانچ ایسی قومیں ہیں جن کے پاس ایٹمی ہتھیار ہیں۔ مگر اب انڈیا اور پاکستان کی طرف سے ایٹمی دھماکہ کے بعد ایسی طاقتوں کی تعداد سات ہو چکی ہے۔ حتی کہ فرانس نے تجویز کیا ہے کہ ان کو شامل کرتے ہوئے سات نیو کلیر قوموں (N-7) کا اجتماع بلایا جائے۔ عجیب بات ہے کہ انڈیا اور پاکستان دونوں ایک دوسرے کو اپنا دشمن سمجھتے ہیں مگر دونوں نے مئی میں جو ایٹمی دھماکے کئے ہیں ان کے پیچھے اصل دماغ دونوں جگہ دو مسلم سائنس دانوں کا ہے۔ انڈیا میں ڈاکٹر عبد الکلام، اور پاکستان میں ڈاکٹر عبد القدیر۔

بی بی سی لندن نے یکم جون ۱۹۹۸ کو پاکستانی سائنس داں ڈاکٹر عبد القدیر کا ایک انٹرویو نشر کیا۔ ان سے پوچھا گیا کہ ایسے خونیں اور امن شکن ہتھیار آپ کیوں بنا رہے ہیں۔ ان کا جواب یہ تھا کہ : ایٹم بم کو میں سب سے بڑا ضامن امن (peace guaranter) سمجھتا ہوں اب جب کہ انڈیا اور پاکستان دونوں کے پاس ایٹم بم ہیں تو مجھے یقین ہے کہ اب ان کے درمیان کبھی جنگ نہیں ہو گی۔

مگر ایک غیر جانب دار مبصر کے لئے اس سے اتفاق کرنا مشکل ہے۔ پاکستان کا کہنا کہ انڈیا نے جارحیت کر کے کشمیر پر قبضہ کر رکھا ہے۔ یہی وہ مسئلہ ہے جس کے لئے ہمیں ایٹم بم کی تیاری تک جانا پڑا مگر صرف ایٹم بم بنانے سے پاکستان کو کشمیر نہیں مل سکتا۔ زیادہ سے زیادہ یہ ہو سکتا ہے کہ وہ انڈیا کو پاکستان کے خلاف کسی آئندہ جارحیت سے روک سکے مگر تمام واقعات بتاتے ہیں کہ انڈیا کا ایسا کوئی جارحانہ ارادہ نہیں۔

پھر پاکستان نے ایٹم بم کیوں بنایا اگر پاکستان اپنے ایٹم بم کو استعمال کرے تو خود ڈاکٹر عبد القدیر کے اعتراف کے مطابق یہ اس کے لئے ایک خودکشی کا فعل ہو گا جس میں کشمیر اور پاکستان دونوں تباہ ہو جائیں گے۔ گویا کہ ایٹم بم کو استعمال کرنا یا اس کو استعمال نہ کرنا دونوں ہی

پاکستان کے لئے غیر مفید ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ موجودہ حالت میں پاکستان کے لئے دوسرا زیادہ بہتر انتخاب (choice) موجود تھا اور وہ تھا صورت موجودہ (status quo) کو مان لینا۔

نہایت مہنگی قیمت پر ایٹم بم بنانے کے باوجود پاکستان کے لئے یہی مقدر ہے کہ وہ کشمیر کے معاملہ میں صورت موجودہ (لائن آف ایکچول کنٹرول) پر نہ چاہتے ہوئے بھی راضی رہے۔ کیوں کہ اس کا دوسرا بدل صرف قومی خودکشی ہے۔ ایسے حالات میں پاکستان کو یہ کرنا چاہیے تھا کہ وہ اس معاملہ میں امریکہ اور دوسری مغربی قوموں کی پیشکش کو مان لے۔ اس پیشکش میں اس کو دو قیمتی چیزیں مل رہی تھیں۔۔ ایک نہایت فیاضانہ اقتصادی امداد۔ دوسرے امریکہ کی طرف سے قابل اعتماد نیوکلیر تحفظ۔

حقیقت یہ ہے کہ ایٹم بم نہ انڈیا کے لئے مفید ہے اور نہ پاکستان کے لئے۔ دونوں ہی کے لئے وہ سفید ہاتھی پالنے کے ہم معنی ہے۔ دونوں ہی نے اس کو اپنے قومی فخر (pride) کے لئے بنایا ہے نہ کہ حقیقی معنوں میں قومی دفاع کے لئے جب متفقہ طور پر ایٹم بم قابل استعمال ہی نہ ہو تو کوئی فوجی مقصد اس سے کس طرح حاصل کیا جاسکتا ہے۔ موجودہ زمانہ میں فوجی یا غیر فوجی مقاصد کے لئے پرامن ڈائیلاگ ہی ایک ممکن تدبیر ہے۔ متشددانہ تدبیر اب سرے سے قابل عمل ہی نہیں پر تشدد عمل میں یقینی خطرہ ہے کہ آج جو کچھ آپ کے پاس ہے وہ بھی آپ کے پاس باقی نہ رہے۔

یہاں میں اضافہ کروں گا کہ پچھلے کچھ سالوں سے برازیل اور ارجنٹینا کے درمیان ایٹمی اسلحہ کی وہی دوڑ جاری تھی جو آج انڈیا اور پاکستان میں دکھائی دے رہی ہے۔ مگر اس کے برے اقتصادی نتائج کو دیکھ کر دونوں ملکوں کے سنجیدہ لوگ تڑپ اٹھے۔ دونوں نے آپس میں گفت شنید شروع کردی یہاں تک کہ ۱۹۹۷ میں دونوں ملکوں میں ایک مشترکہ فیصلہ کے ذریعہ ایٹمی اسلحہ کی تیاری مکمل طور پر بند کردی گئی اور اپنے وسائل کو پوری طرح اقتصادی ترقی کی طرف موڑ دیا گیا۔

برازیل اور ارجنٹینا کا یہ فیصلہ بلاشبہ نہایت درست ہے۔ انڈیا اور پاسکتان دونوں کو اسی فیصلہ کی پیروی کرنا چاہیئے۔ ایٹمی ہتھیاروں کا راستہ بلاشبہ دونوں کے لئے تباہ کن ہے، خواہ یہ ہتھیار استعمال ہوں یا استعمال نہ ہوں۔

۲۰ویں صدی کے نصف اول کا زمانہ بر صغیر ہند کے لئے نازک زمانہ تھا۔اس زمانہ کے لوگ ایک قسم کے رومانی تصورات میں جی رہے تھے۔وہ ذہنی طور پر اس کے لئے تیار تھے کہ کوئی شخص خوبصورت نظریہ پیش کرے تو وہ دوڑ کر اسے قبول کرلیں۔اس زمانہ کے ہندوؤں اور مسلمانوں میں مختلف قسم کے اہل فکر اٹھے۔انھیں میں سے ایک گروہ وہ تھا جو نظریاتی انتہا پسندی میں مبتلا تھا اور طلسماتی الفاظ کے ذریعہ اپنی قوم کو اس کی طرف بلا رہا تھا۔ان میں سے ایک کو میں ہندو انتہا پسند اور دوسرے کو مسلم انتہا پسند کا نام دونگا۔چونکہ اس وقت دونوں فرقوں میں رومانی جوش خروش پایا جارہا تھا۔اس لئے جوانوں کی بڑی تعداد دونوں طرف اکٹھا ہوگئی۔اس طرح تقریباً ایک ہی زمانہ میں دو مختلف گروہ وجود میں آئے۔ایک ہندو انتہا پسندوں کا گروہ اور دوسرا مسلم انتہا پسندوں کا گروہ۔۲۰ویں صدی میں بر صغیر ہند میں جو تباہ کن حالات پیش آئے اس کے سب سے بڑے ذمہ دار یہی دونوں انتہا پسند گروہ ہیں۔

نظریاتی انتہا پسندی ایک قسم کا جنون ہے۔ایسے لوگ ہمیشہ تاریخ کو اپنے خود ساختہ نظریات میں ڈھالنے پر اصرار کرتے ہیں۔وہ تاریخ کے پہیہ کو الٹی طرف چلانے کی کوشش کرتے ہیں۔اس کے نتیجہ میں تاریخ کا سفر تو الٹی طرف جاری نہیں ہوتا البتہ ترقی اور تعمیر کے کے امکانات تباہ ہو کر رہ جاتے ہیں۔

ہندو انتہا پسند گروہ کے پچھلے پچاس سال کے ریکارڈ کو دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ انھوں نے اس مدت میں صرف تین بڑے کارنامے انجام دیئے ہیں۔اول، ۱۹۴۸ میں مہاتما گاندھی کو گولی مار کر ہلاک کرنا۔دوم، ۱۹۹۲ میں اجودھیا کی تاریخی مسجد کو ڈھادینا جب کہ اس کا کیس ابھی عدالت میں زیر سماعت تھا۔سوم، ۱۹۹۸ میں پانچ ایٹمی دھماکے کرکے اس پورے علاقے میں ایٹمی ہتھیار کی دوڑ شروع کردینا۔

یہ بات میں نے دہلی کی ایک مجلس میں آر ایس ایس اور اس کی پولیٹیکل ونگ بھارتیہ

جنتاپارٹی کے بارے میں ان الفاظ میں کی:

There are three feats to their credit: In the 1948 they killed Mahatma Ghandhi. In 1992.........

مسلم انتہا پسندوں کا ریکارڈ بھی اس معاملہ میں کچھ زیادہ مختلف نہیں۔ اپنے نظریاتی جنون کے تحت انھوں نے ۱۹۴۷ میں بر صغیر ہند کا بٹوارہ کرایا۔ اور اس پورے علاقہ میں ابدی طور پر نفرت کی فصل اگائی۔ اس کے بعد اسی نظریاتی جنون کے تحت انھوں نے نام نہاد اسلامی جنگ جوئی کا طوفان برپا کیا جس کے نتیجہ میں نہ صرف لیاقت علی خاں (وفات ۱۹۵۱) اور ذوالفقار علی بھٹو (وفات ۱۹۷۹) جیسے بہت سے لوگوں کو قتل کیا گیا بلکہ کشمیر میں اور خود پاکستان میں تشدد کا ایک آتشیں جنگل اگ آیا جس کا بظاہر کوئی خاتمہ نظر نہیں آتا۔ اور پھر یہی مسلم انتہا پسند ہیں جنھوں نے وہ حالات پیدا کئے جس کا آخری نتیجہ یہ ہوا کہ انڈیا اور پاکستان ہلاکت خیز انجام کے کنارہ کھڑے ہو گئے۔

انتہا پسندی کی سب سے بڑی خرابی یہ ہے کہ وہ سمجھوتہ اور مصالحت (conciliation) کو نہیں جانتی ایسے لوگ صرف ایک بات کو جانتے ہیں۔ اور وہ ہے ساری دنیا کو اپنے خیالات کے سانچے میں ڈھالنا۔ یہی وجہ ہے کہ نظریاتی انتہا پسندی ہمیشہ نفرت اور تشدد تک پہنچتی ہے۔ بد قسمتی سے بر صغیر ہند میں ہندو انتہا پسندی اور مسلم انتہا پسندی دونوں نے ہمارے سماج میں یہی غیر مطلوب فصل اگائی ہے۔

38

کسی لیڈر کی سب سے زیادہ تباہ کن چیز نظریاتی جنون ہے۔ لیڈر کے دماغ میں جب ایک نظریہ بس جائے تو بقیہ تمام چیزیں اس کے لئے ثانوی بن جاتی ہیں۔ وہ اپنے خود ساختہ نظریہ کو قائم کرنے کے لئے تمام دوسری چیزوں کو بلڈوز کرنے کے لئے تیار ہو جاتا ہے، یہاں تک کہ اخلاق اور انسانیت جیسی اعلیٰ قدروں کو بھی۔ اسٹالن نے اپنے اسی نظریاتی جنون کی بنا پر ۲۵ بلین انسانوں کو ہلاک کر دیا۔ ہٹلر نے اپنے اسی نظریاتی جنون کی بنا پر تاریخ کی وہ ہولناک جنگ چھیڑ دی

جس کو دوسری عالمی جنگ کہا جاتا ہے، وغیرہ۔

بد قسمتی سے بر صغیر ہند بھی آزادی کے بعد اس قسم کے نظریاتی جنون کا شکار ہو رہا ہے۔ پاکستان میں وہاں کے نام نہاد اسلام پسندوں نے اپنے نظریاتی جنون کے تحت پاکستان کے تمام بہترین امکانات کو ملیا میٹ کر دیا۔ انڈیا میں پہلے ہمارا ملک نہرو کے سوشلسٹ جنون کا شکار ہوا۔ اب وہ بھاجپا کے ہندتو جنون کا شکار ہو رہا ہے۔ یہ صرف خدا کو معلوم ہے کہ اس قسم کی جنونی سیاست بر صغیر ہند میں مزید کب تک جاری رہے گی۔

ہر سماج میں ایسے افراد ہو سکتے ہیں جو اپنے نظریہ کے حق میں مجنونانہ یقین رکھتے ہوں۔ دوسری طرف یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ سماج میں ہمیشہ مختلف سوچ اور مختلف نظریہ رکھنے والے پائے جاتے ہیں۔ اب سوال یہ ہے کہ مختلف اور متضاد ذہن رکھنے والوں کے درمیان حکومتی نظام کس طرح بنایا جائے یہ ضروری ہے کہ ہمارے پاس اس مقصد کے لئے پر امن اور قابل عمل فارمولا موجود ہو۔ بصورت دیگر، ہر سماج ابدی طور پر تشدد کا سماج بنا رہے گا۔

یہ فارمولا دریافت ہو چکا ہے اور اس فارمولے کا نام ڈیموکریسی ہے۔ اس کا خلاصہ یہ ہے کہ سماج کے مختلف گروہ اس پر راضی ہو جائیں کہ حکومت سازی کا معاملہ الیکشن پراسس کے حوالے کر دیا جائے۔ ہر پانچ سال پر آزادانہ اور منصفانہ (free and fair) الیکشن منعقد کیا جائے اس الیکشن میں جو گروہ بھی جائز طور پر اکثریت لائے اس کو محدود مدت کے لئے حکومت (صحیح تر لفظ میں، ایڈمنسٹریشن) کا کام چلانے کا موقع دیا جائے۔ یہ فاتح گروہ دل سے راضی رہے کہ اگلے الیکشن میں اگر وہ ہار جاتا ہے تو وہ اسی طرح معتدل طور پر اپنی ہار کو قبول کر لے گا جس طرح اس سے پہلے اس نے اپنی جیت کو قبول کیا تھا۔

اس کے بعد وہ لوگ ہیں جو اپنے دماغوں میں کوئی اصلاحی نظریہ رکھتے ہیں مگر عوامی رائے بر وقت ان کے ساتھ نہیں ہے ایسے لوگوں کے لئے واحد صحیح اور قابل عمل بات یہ ہے کہ وہ انتظار کی پالیسی اختیار کریں۔ یعنی وہ جائز حدود میں اپنے نظریہ کی پر امن تبلیغ کریں وہ لوگوں کو ایجوکیٹ

وقت ان کے ساتھ نہیں ہے ایسے لوگوں کے لئے واحد صحیح اور قابل عمل بات یہ ہے کہ وہ انتظار کی پالیسی اختیار کریں۔ یعنی وہ جائز حدود میں اپنے نظریہ کی پر امن تبلیغ کریں وہ لوگوں کو ایجوکیٹ کر کے ان کے ذہن کو اپنے موافق بنانے کی کوشش کریں۔ اس عمل میں وہ نہ کوئی متشددانہ طریقہ اختیار کریں اور نہ غیر اخلاقی طریقہ۔ وہ اسی طرح پرچار کے دائرہ میں اپنی تعمیری مہم جاری رکھیں۔ یہاں تک کہ وہ وقت آجائے جب کہ خود انتخابی عمل ان کے حق میں فیصلہ دے دے۔

39

۱۹۴۷ میں جب ایک طرف انڈیا اور دوسری طرف پاکستان بنا تو اول دن ہی سے دونوں میں حریفانہ تعلق قائم ہو گیا۔ حریفانہ تعلق قائم ہونا کوئی بری چیز نہیں۔ وہ ترقی کا زینہ ہے۔ کہا جاتا ہے کہ امریکہ کی ترقی کا راز روس کی صورت میں اس کے ایک حریف کا وجود میں آنا تھا۔ چنانچہ جب ۱۹۹۱ میں سوویت یونین ٹوٹ گیا تو امریکی ماہرین یہ کہنے لگے کہ ہمیں اب کوئی دوسرا حریف تلاش کرنا چاہیے ورنہ ہمارے یہاں ترقی کا عمل رک جائے گا۔

واقعہ یہ ہے کہ حریفانہ کشاکش اپنی ذات میں کوئی بری چیز نہیں ہے۔ یہ خود فطرت کا بنایا ہوا کورس ہے۔ فطرت نے انسانی ترقی کے لئے یہی کورس مقرر کیا ہے کہ لوگوں میں مقابلے ہوں اور ان مقابلوں کے دوران ہر ایک اپنے کو اونچا دکھانے کی کوشش کرے اور اس طرح انسانیت کی مجموعی ترقی جاری رہے۔

انڈیا اور پاکستان کے درمیان حریفانہ کشمکش پیش آئی وہ اپنی ذات میں اس قسم کی ایک چیز تھی۔ مگر یہ حریفانہ کشمکش دونوں ہی ملکوں کے لئے تباہی کا ذریعہ بن گئی۔ اس کا سبب یہ ہے کہ ہمارے یہاں اس حریفانہ کشمکش نے منفی رخ اختیار کر لیا ہمارے یہاں یہ حریفانہ کشاکش منفی کشاکش بن گئی وہ مثبت رخ اختیار نہ کر سکی۔

ابتدا میں دونوں ملکوں کا میڈیا ایک دوسرے کے خلاف منفی پروپیگنڈے کے لئے وقف ہو گیا۔

تجربہ ہوتا ہے۔وہ انڈیا واپس آکر کہتا ہے کہ پاکستان کے لوگ تو ہم سے انسانیت اور پیار کے ساتھ ملتے ہیں پھر دونوں ملکوں میں قومی سطح پر دشمنی کیوں۔

یہی معاملہ ان پاکستانی مسلمانوں کے ساتھ پیش آتا ہے جو پاکستان سے انڈیا آتے ہیں۔ اور یہاں کے ہندوؤں سے انفرادی طور پر ملتے ہیں وہ بھی پاکستان واپس جاکر یہی بات کہتے ہیں کہ انڈیا کا ہندو تو ہم سے انتہائی پیار کے ساتھ ملا۔پھر کیا وجہ ہے کہ قومی سطح پر دونوں ملکوں کے درمیان مسلسل دشمنی قائم ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ دونوں ملکوں میں جب ہندو اور مسلمان آپس میں ملتے ہیں تو یہ ایک انسان کی دوسرے انسان سے ملاقات ہوتی ہے۔جب بھی ایک انسان دوسرے انسان سے انفرادی طور پر ملے تو یہ ملاقات فطرت کے دو پیکروں کے درمیان ہوگی،اور جہاں تک فطرت کا سوال ہے وہ ایک ہندو کے اندر بھی وہی ہے جو ایک مسلمان کے اندر ہے۔

مگر قومی تعارف کا معاملہ اس سے مختلف ہے۔انفرادی ملاقات میں دونوں کی رہنما ان کی فطرت ہوتی ہے مگر ایک پاکستانی مسلمان جب ہندستانی قوم کے بارے میں جاننا چاہے تو وہ اپنی اس واقفیت کو اخبارات کے ذریعہ حاصل کرتا ہے۔اسی طرح جب ایک ہندستانی ہندو پاکستانی قوم سے آگاہ ہونا چاہے تو وہ بھی اخبارات کے ذریعہ یہ آگہی حاصل کرتا ہے۔اور جب کہ معلوم ہے اخبارات صرف نفرت وعداوت کے باتیں چھاپتے ہیں وہ حریف قوم کو ایک قابل نفرت دشمن کے روپ میں پیش کرتے ہیں۔

انفرادی اور قومی تصویر کا یہ فرق اس مطالعہ کے فرق کا نتیجہ ہے۔اگر دونوں ملکوں کے اخبارات میڈیا کو ہٹا دیا جائے اور دونوں ملکوں کے لوگ ایک دوسرے کے بارے میں قومی تعارف بھی اس طرح براہ راست حاصل کریں جس طرح وہ انفرادی تعارف براہ راست حاصل کرتے ہیں تو یہ تضاد ختم ہو جائے گا۔

ہیں تو یہ تضاد ختم ہو جائے گا۔

40

قرآن کی سورہ نمبر ۱۰ میں فطرت کا ایک قانون ان الفاظ میں بتایا گیا ہے۔ پھر ہم نے ان کے بعد تم کو زمین میں با اقتدار بنایا تا کہ ہم دیکھیں کہ تم کیسا عمل کرتے ہو (یونس ۱۴)

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ زمین میں جب کسی فرد یا گروہ کو سیاسی اقتدار ملتا ہے تو وہ اس کا ذاتی حق نہیں ہوتا۔ زمین خدا کی ہے اور وہی جس کو چاہتا ہے اس کو یہاں اقتدار عطا کرتا ہے، یہ اقتدار ہر ایک کے لئے صرف محدود مدت کے لئے ہوتا ہے، اور اس کا مقصد یہ ہوتا کہ سیاسی مواقع دے کر اس کو جانچا جائے کہ اس نے اپنے اختیار کو کس طرح استعمال کیا۔ پھر اس کی اس کارکردگی کی بنیاد پر آخرت میں اس کے لئے انعام یا سزا کا فیصلہ کیا جائے گا۔

اس اعتبار سے بر صغیر ہند کو دیکھئے۔ پانچ سو سال پہلے یہاں مختلف راجاؤں کی حکومت تھی۔ اس کے بعد مغلوں کا سیاسی دور آیا جو انیسویں صدی کے وسط تک جاری رہا۔ اس کے بعد انگریزوں کو اس ملک میں سیاسی اقتدار ملا۔ یہ اقتدار ۱۹۴۷ میں ختم ہو گیا۔ اس کے بعد ملک کے دو حصے ہو گئے۔ ایک حصے میں ہندو اکثریت کو سیاسی بالاتری حاصل ہوئی اور دوسرے حصے میں مسلم اکثریت کو سیاسی بالاتری کی حیثیت حاصل ہوئی۔

پچھلے تمام سیاسی دور صرف وقتی تھے۔ ان میں سے کوئی بھی مستقل نہ تھا اسی طرح موجودہ سیاسی دور بھی صرف وقتی ہے۔ دونوں میں سے کسی فرقہ کو یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ اس کو مستقل طور پر زمین کے اس حصے کا سیاسی الاٹ مینٹ مل گیا ہے۔ دونوں ہی گروہ، قرآن کے مطابق مالک کائنات کی براہ راست نگرانی میں ہیں۔ وہ جب تک چاہے گا ان کا اقتدار رہے گا، اور جب وہ چاہے گا دونوں کا اقتدار ختم کر کے کسی اور گروہ کو یہ سیاسی مواقع دے دے گا۔

اس اعتبار سے دیکھئے تو ہندو اور مسلمان دونوں ہی گویا سیاسی امتحان ہال میں بیٹھے ہوئے ہیں۔ دونوں ہی کو ایک مشترک پرچہ حل کرنا ہے، وہ پرچہ کیا ہے، وہ پرچہ یہ ہے کہ دونوں ہی

لئے ایک ذمہ داری سمجھیں نہ کہ کوئی ذاتی حق کا معاملہ۔ وہ اس بارے میں آخری حد تک سنجیدہ ہوں کہ انھیں اپنے اختیار کو ذاتی خواہش کے تحت استعمال نہیں کرنا ہے بلکہ اس کو خدا کی مرضی کے تحت استعمال کرنا ہے۔ وہ پورے شعور کے ساتھ اس حقیقت کو اپنے ذہن میں تازہ رکھیں کہ انھیں اپنے ہر قول و عمل کے لئے خدا کی عدالت میں اپنا حساب دینا ہے جہاں انصاف کے سوا کسی بھی دوسری چیز کی کوئی قیمت نہ ہو گی۔

دونوں فرقوں کو یہ جاننا چاہیے کہ انھیں یہ سیاسی موقع اس لئے دیا گیا ہے کہ وہ خدا کی زمین کو سنواریں نہ کہ اس کو بگاڑیں۔ وہ خدا کے بندوں کو انصاف دیں نہ کہ انھیں اپنے ظلم کا نشانہ بنائیں۔ وہ تمام انسانوں کو راحت پہنچائیں نہ کہ انھیں نئے نئے مسائل میں الجھا دیں، وہ ملک کے وسائل کو ملک کی مثبت تعمیر میں لگائیں، نہ کہ اس کو اپنے ذاتی عیش یا ذاتی برتری کے لئے استعمال کریں۔ وہ ان مواقع کو خدا کی امانت سمجھیں نہ کہ ذاتی ملکیت۔

صبح کو جب سورج طلوع ہوتا ہے تو وہ اس بات کا پیغام دیتا ہے کہ مالک کائنات تمہاری نگرانی کر رہا ہے۔ ہر روز جب رات آتی ہے تو وہ یہ پیغام لاتی ہے کہ تمہارا عروج بھی لازماً زوال کا شکار ہو گا۔ زمین کی مسلسل گردش بتا رہی ہے کہ اس دنیا میں نہ کسی کی زندگی کے لئے ٹھہراؤ ہے اور نہ کسی کی سیاسی اقتدار کے لئے۔ یہ گویا دونوں گروہوں کے لئے، اور اس طرح تمام انسانوں کے لئے فطرت کی زبان میں خدا کی ایک چیتاؤنی ہے۔ دانش مند وہ ہے جس کے لئے یہ چیتاؤنی اس کی اصلاح حال کا ذریعہ بن جائے اور نادان وہ ہے جو اس چیتاؤنی کو نظر انداز کر دے، اس کے لئے ذلت اور ناکامی کے سوا کوئی دوسرا انجام نہیں۔